Editing of Iqbalian Texts and Their Intellectual Significance: A Critical Study of Bashir Ahmad Nahvi's Edited Urdu Works

اقبالیاتی متون کی تدوین اور فکری معنویت: بشیر احمد نحوی کی مرتبہ اُردو کتب کا تنقیدی مطالعہ

Dr. Talib Hussaim Hashmi*[1]
Assistant Professor(Adjunct Faculty), Department Of Urdu, MY University, Islamabad
Adeela Qamar*[2]
M.Phil Urdu Scholar, Department of Urdu, MY University, Islamabad

☆[1]ڈاکٹر طالب حسین ہاشمی
اسسٹنٹ پروفیسر (ایڈجنک فیکلٹی)، شعبہ اردو، مائی یونیورسٹی، اسلام آباد
☆[2]عدیلہ قمر
ایم۔فل اُردو اسکالر، شعبہ اُردو، مائی یونیورسٹی اسلام آباد

Correspondance: drtalibhashmi@gmail.com

eISSN:**3005-3757**
pISSN: **3005-3765**

Received: 19-10-2025
Accepted:24-12-2025
Online:31-12-2025

Copyright:© 2023 by the authors. This is an access-openarticle distributed under the terms and conditions of

ABSTRACT: This study presents a critical examination of the editing of Iqbalian texts and their intellectual significance with special reference to the Urdu books edited by Bashir Ahmad Nahvi. Iqbal studies constitute a vital area of Urdu literary and intellectual tradition, where the role of editors is as significant as that of commentators and critics. Bashir Ahmad Nahvi emerges as an important figure who contributed to the preservation, organization and interpretation of Iqbal's thought through his editorial endeavors. This research aims to analyze Nahvi's editorial methodology, selection of texts, arrangement, annotations and overall scholarly approach in his edited Urdu works on Iqbal.The study explores how Nahvi's editorial practices help shape the understanding of Iqbal's philosophical, poetic and ideological discourse. It evaluates the extent to which his editorial interventions maintain textual authenticity while also facilitating intellectual clarity for readers,

the Creative Common Attribution (CC BY) license

researchers and students of Iqbal. By focusing on selected edited texts, the research highlights Nahvi's contribution to the continuity and development of Iqbalian scholarship, particularly in making complex ideas accessible without compromising academic rigor. Furthermore, the study situates Bashir Ahmad Nahvi's work within the broader tradition of Iqbalian editing and scholarship, identifying both its strengths and limitations. It argues that Nahvi's editorial efforts play a meaningful role in reinforcing the intellectual relevance of Iqbal in modern times, especially within Urdu literary studies. Through a qualitative and analytical approach, this research underscores the importance of editorial work as a constructive intellectual activity that not only preserves texts but also actively participates in the formation of meaning. Ultimately, the study seeks to establish Bashir Ahmad Nahvi as a significant contributor to Iqbaliyat, whose edited works reflect a conscious balance between textual fidelity and intellectual interpretation, there by enriching contemporary engagement with Iqbal's thought.

KEYWORDS: Iqbalian Texts, Bashir Ahmad Nahvi, Editing, Intellectual Significance, Iqbal Studies, Urdu Literature,

بشیر احمد نحوی اقبال شناسوں میں اس اعتبار سے ممتاز مقام رکھتے ہیں کہ اُنھوں نے اقبال کی شخصیت اور فکر و فن کے گوناگوں پہلوؤں کو محض تحقیقی ذمہ داری کے طور پر نہیں، بل کہ والہانہ عقیدت اور قلبی وابستگی کے تحت موضوعِ مطالعہ بنایا۔ اقبال کے کلام کی تفہیم، ان کے فکری نظام کی توضیح اور شخصیت کے باطنی اسرار کی جستجو ان کے ہاں شوقِ محبت کا اظہار ہے، جو ان کی تحریروں کو محض علمی نہیں بل کہ وجدانی کیفیت بھی عطا کرتا ہے۔ اقبال کے اشعار کی تاثیر اور اُن کے فکری سلسلوں کی روانی انہیں مکمل طور پر محو کر دیتی تھی۔ اقبال کے فلسفیانہ اور ادبی چشموں سے سیر اب ہو کر نہ صرف وہ اقبال کے عرفان سے فیض یاب ہوتے، بل کہ اپنی باطنی بصیرت کو بھی اجاگر کرتے۔ نحوی صاحب نے بطور نقاد فکرِ اقبال پر نمایاں خدمات انجام دیں اور متعدد کتابیں مرتب بھی کیں۔ غالباً یہ کوشش اس محرک سے ہوئی کہ فکرِ اقبال کے ایسے گوشے جو کم زیرِ بحث آئے ہوں یا جن پر معتبر نقادوں نے محدود انداز میں اظہارِ خیال کیا ہو، اُنہیں منظم کر کے قارئین کے

لیے قابلِ استفادہ بنایا جائے۔ یوں انہوں نے اقبال کے کلام کی تشنگی کو پورا کرنے اور نئے زاویوں سے پیش کرنے کا کام انجام دیا۔

بشیر احمد نحوی وہ ماہر اقبالیات ہیں جنھوں نے اقبال کی شخصیت اور فن کے مختلف گوشوں پہ صرف اس لیے روشنی ڈالی ہے کہ ان کو اقبال کی شخصیت اور کلام سے بے پناہ محبت تھی۔ اقبال کے کلام کی تاثیر اور لے اُن کو بے خود کیے دیتی تھی اور اقبال کے فِکری چشموں سے سیر اب ہو کر وہ نہ صرف اقبال کا عرفان حاصل کیا کرتے تھے بل کہ خُود اپنے باطن کی تفہیم کا کام بھی لیتے تھے۔ اُنھوں نے بہ طور نقاد فکرِ اقبال پہ بہت سارا کام کیا ہے۔ اُنھوں نے بعض کتابیں مرتب بھی کی ہیں، شاید اس کا محرک یہ رہا ہو کہ جو چیز فکرِ اقبال کے بارے تشنگی کا احساس دلاتی ہو اس کو اس طرح پورا کیا گیا ہو یعنی فکرِ اقبال کے جس موضوع پر ان کے خیال سے کم لکھا گیا ہو یا کسی معتبر نقاد نے اظہارِ خیال کیا ہو، اس کو مرتب کر کے قارئین کے سامنے پیش کیا جائے۔ اس حوالے سے ان کی ایک مرتبہ کتاب بہ عنوان ''اقبال کی تجلیات'' ہے۔

''اقبال کی تجلیات'' کے عنوان سے اقبال پر پروفیسر بشیر احمد نحوی کے مرتبہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ اِس کتاب کو اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونی ورسٹی سری نگر نے ۲۰۰۲ء میں شایع کیا۔ اِس کتاب کا دیباچہ بشیر احمد نحوی کا ہی رقم کردہ ہے جس میں اُنھوں نے اقبال پر ہونے والے علمی، ادبی، تحقیقی و تنقیدی کام کو خراج تحسین پیش کیا ہے اور اسے ادبی اُفق میں توسیع قرار دیا ہے۔ اِس کتاب کا ''انتساب'' اُنھوں نے پروفیسر محمد امین اندرابی کے نام کیا ہے۔

اس کتاب میں درج ذیل مضامین شامل ہیں:

1۔ مطالعۂ رومی کی تاریخ میں اقبال کا مقام	ڈاکٹر سید عبداللہ
2۔ فلسفۂ وجودیت اور اقبال	ڈاکٹر سمیع اللہ قریشی
3۔ اسلامی فکر و عمل کا معمارِ نو۔ اقبال	ڈاکٹر غلام جیلانی برق
4۔ اقبال کی دانشِ نورانی	پروفیسر رشید احمد صدیقی
5۔ حالی اور اقبال کے مقامات آہ و فغاں	سلیم اختر
6۔ اقبال اور متعلمین اقبال	قاضی عبدالقادر
7۔ اقبال کی مثنویات	عبدالرحمٰن بجنوری

پروفیسر ڈاکٹر بشیر احمد نحوی کے اقبالیات کے حوالے سے اپنے مضامین میں بھی تنوع نُدرت اور جِدت پائی جاتی ہے۔ ان کے پاس اقبال کی فِکر کی پرکھ کے بہت سارے زاویے ہیں۔ ہر زاویہ ایک الگ لو دیتا ہے۔ ان کی مرتبہ کتب میں بھی فِکری و فنی حوالے سے بہت تنوع ہے۔ اُنھوں نے اپنی کسی بھی کتاب میں کسی ایسے مضمون کو جگہ نہیں دی جو کہ روایتی طرز کی تنقید پر مشتمل ہو۔ درج بالا کتاب میں مضامین کی نُدرت اور تنقیدی زاویوں کے حوالے سے بہت تنوع ہے۔ اس حوالے سے پروفیسر ڈاکٹر بشیر احمد نحوی لکھتے ہیں:

''اقبال کی تجلیات'' چند ایسے منتخب مضامین ہیں جو متعلمین اقبال کو نئی راہوں اور فکر و نظر کی نئی منزلوں کی طرح راہ نمائی کر سکتے ہیں۔ سید عبد اللہ، غلام جیلانی برق، سمیع اللہ قریشی، عبد القادر اور رشید احمد صدیقی کے مقالات پڑھ کر اقبال شناسی سے متعلق اچھوتے گوشے ہمارے سامنے آ جاتے ہیں۔''(1)

جیسا کہ اس ''پیش لفظ'' کے درج بالا اقتباس سے ہی یہ واضح ہے کہ بشیر احمد نحوی کے مرتب کردہ اس مجموعۂ مضامین میں اِنفرادیت کے عناصر چھلکتے ہیں۔ یہ انفرادیت نہ صرف فکر و فن کی تفہیم کی سطح تک ہے بلکہ اور بھی بہت سارے زاویے اِقبالیات کی تفہیم کے لیے شامل ہو جاتے ہیں۔

''اقبال کی تجلیات'' کا پہلا مضمون ''مطالعۂ رومی کی تاریخ میں اقبال کا مقام'' کے عُنوان سے ہے۔ اس موضوع کا عنوان ہی بہت نادر و نایاب اور عام سطح کی اقبالیات کے حوالے سے کی جانے والی تحقیق سے ہٹ کر ہے۔ اس مضمون میں سید عبد اللہ نے اِقبال کی مولانا روم فہمی کے بارے بتایا ہے یہ نادر و نایاب موضوع ہے۔ یہ بات ہر وہ بندہ جانتا ہے جس نے اقبال کو کچھ نہ کچھ حد تک پڑھا ہوا ہے کہ اقبال نے مولانا روم کو اپنا معنوی اور روحانی استاد تسلیم کیا ہے۔ اس مضمون میں سید عبد اللہ نے مولانا رومی کے مطالعہ کے مختلف عہد میں متعین کیے جانے والے معنی و مفاہیم کو بھی صراحت سے بیان کیا ہے۔ فارسی ادب سے ذرا سی بھی شُدبُد رکھنے والا بندہ اس حقیقت کو جان سکتا ہے کہ مولانا رُوم کا انتقال ۱۲۷۳ء عیسوی میں ہوا۔ اس کے بعد آج تک بہت سارے ادبا نے ان کی مثنوی پہ کام کیا۔ معنی و مفاہیم کے خزانے بھی تلاشے، فارسی زبان و ادب کی کوئی بھی دوسری شاہکار کتاب اس کے مقابلے میں نہ آ سکی؛ سوائے ''دیوانِ حافظ'' کے؛ لیکن دیوانِ حافظ اور مثنوی مولانا روم میں بنیادی فرق یہ ہے کہ دیوانِ حافظ محض شعر و حکمت کی کتاب ہے جب کہ مثنوی شعر و حکمت کی کتاب ہونے کے ساتھ ساتھ اسرار دین اور علم الکلام کا بھی مجموعہ ہے۔ مولانا روم کی مثنوی کے مطالعہ اور تتبع کا ذکر کیا جائے تو یہ روایت ان کی زندگی میں ہی پڑ گئی تھی جب ان کے بیٹے سلطان ولد نے ''رباب نامہ'' کے نام سے ایک مثنوی لکھی۔

اس کے بعد اس روایت میں حصّہ ڈالنے والا ایک بڑا نام حسین خوارزمی کا ہے۔ دسویں صدی میں اکبر کا زمانہ تعقل اور عقل پسندی کا زمانہ تھا اس لیے خاص پزیرائی نہ مل سکی۔ اِس کے بعد شاہ جہاں کے عہد کے آخر میں مُطالعہ مثنوی کا رجحان پھر زوروں پہ ہو گیا۔ عہدِ عالم گیری میں بھی یہ رجحان جاری رہا۔ اسی طرح اس کے بعد کے بہت سارے اَدوار میں بھی مثنوی کی تفہیم کی روایت جاری رہی۔ جدید زمانے میں اِس مثنوی کے مُطالعہ پہ اقبال کس طرح رائے دیتے ہیں یا ان کا اس مثنوی کے مطالعہ کا زاویہ کیا ہے؟ یوں ہم دیکھتے ہیں کہ ''مثنوی معنوی'' جو کہ مولانا رُوم کا فارسی ادب کا شاہکار ہے، اس کی تفہیم کی بہت پرانی اور مربوط روایت موجود ہے؛ لیکن اقبال نے اس کی تفہیم اور پرَکھ میں جو نادر خیالات پیش کیے ہیں اور جو جو نکات اس مثنوی کی تفہیم سے اخذ کیے ہیں، وہ اپنی مثال آپ ہیں۔

''اقبال کی تجلیات'' کے دوسرے مضمون کا نام ''فلسفۂ وجودیت اور اقبال'' ہے۔ اس کے لکھاری سمیع اللہ قریشی ہیں۔ اقبال چوں کہ جدید زمانے کے تمام نظریات اور فلسفوں سے کماحقہ واقفیت رکھتے تھے۔ اس لیے ان کی شاعری میں بعض فلسفوں کے حق میں اور بعض فلسفوں کے رد میں بھی اشعار کہے گئے ہیں۔ یہی صورت حال فلسفۂ وجودیت کے ساتھ بھی پیش آئی۔ فلسفۂ وجودیت کے بانیوں نے اس بات پہ زیادہ زور دیا کہ وجود مقدم بر روح ہے یعنی جتنا دکھ درد جھیلنا ہے، جسم کو ہی جھیلنا ہے، وجود کو ہی برداشت کرنا ہو گا۔ فلسفۂ وجودیت میں دو مکتبہ فکر بنیادی ہیں: خُدا کے وجود کے حوالے سے کریکے گارڈ کہتا کہ خدا ہے اس کا وجود بھی ہے جب کہ اس کے مقابل نطشے کہتا ہے خدا موجود نہیں ہے۔ اقبال خدا کے وجود پہ یقین رکھنے والے فلسفیوں کی تتبع کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں اور بھی بہت ساری خوبیوں میں وہ وجودی فلسفیوں کے قریب ہیں۔ اسی طرح بہت سارے معاملات میں وجودی فلسفیوں کی بات کو اقبال نے رَد بھی کیا ہے جیسا کہ اجتماعی عبادت کے بارے میں فلسفیوں کی رائے کو اقبال نے رد کیا ہے۔

اس حوالے سے سمیع اللہ قریشی یوں رقم طراز ہیں:

> ''وجودیت پسندوں میں بعض عبادت کا جواز صرف انفرادی سطح پر تسلیم کرتے ہیں۔ وہ کسی اجتماعی نظامِ عبادت کے قائل نہیں۔ ان کے خیال میں کسی اجتماعی طریقِ عبادت سے یہ ممکن ہی نہیں کہ انسان تمام تر اپنی توجہات ایک طرف مرکوز رکھے۔ اقبال اجتماعی عبادت کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں، کیوں کہ ان کے نزدیک اس سے انسانوں کے مشترک جذبات کو تقویت ملتی ہے۔''(2)

یوں مجموعی طور پہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس مضمون میں سمیع اللہ قریشی نے اقبال کے فلسفۂ وجودیت کے بارے میں اشتراکات اور اختلافات کا جائزہ لیا ہے اور شعری مثالیں بھی دی ہیں۔ اس مضمون میں ایک طرف اقبال بطور فلسفی کی جھلک نظر آتی ہے جب کہ دوسری طرف اقبال کی شاعری کی کچھ نئی جہات بھی سامنے آتی ہیں۔

''اقبال کی تجلیات'' کے تیسرے مضمون کا عنوان ''اِسلامی فکر و عمل کا معمارِ نو اقبال'' ہے۔ اس مضمون کے لکھاری غلام جیلانی برق ہیں۔ اِسلامی فکر، دُنیاوی فکر اور باقی مذاہب کی فکر سے بہت حد تک مختلف ہے۔ اقبال نے عقل کی حیثیت کی نفی کیے بغیر عشق کو برتر ثابت کیا ہے۔ عقل کا منبہ و مخرج انسانی دانش کو قرار دیا ہے جب کہ عشق کا سرچشمہ وجدان، الہام اور وحی کو قرار دیا ہے۔ عقل و عشق کے موضوعات کو جس طرح اقبال نے نبھایا۔ ایک اور طرح سے بھی اقبال نے اسلامی فکر کو ندرت بخشی اور اسلامی فکر کے ایک روشن پہلو کو دنیا کے سامنے پیش کیا۔ باقی تمام مذاہب میں دین اور سیاست الگ الگ چیزیں ہیں جب کہ اقبال کی فکر کے مطابق اسلام میں ایسا نہیں ہے۔ اقبال نے مختلف نظریات کو اسلامی فکر سے ہم آہنگ کر کے دیکھا ہے۔ یوں مجموعی طور پہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس مضمون میں غلام جیلانی برق نے اقبال کی ان فِکری جہات کو دریافت کیا ہے جو کہ اسلام سے متعلق ہیں۔

''اقبال کی تجلیات'' کے چوتھے مضمون کا نام ''اقبال کی دانشِ نورانی'' ہے۔ اس کو اُردو کے معروف ادیب و ناقد رشید احمد صدیقی نے لکھا ہے۔ اقبال کی شاعری کا بغور مطالعہ کیا جائے تو بار بار دو طرح کی دانش کا ذکر ملتا ہے: ایک دانشِ برہانی اور ایک دانشِ نورانی۔ دانش برہانی کا تعلق عقل، فکر اور تعقل و دماغ سے ہے جب کہ دانش نورانی کا تعلق دل، روح، وجدان و وحی سے ہے۔ اقبال دانشِ نورانی کے قائل رہے ہیں۔ اُنھوں نے اپنی شاعری میں بھی دانش نورانی کو دانش برہانی پہ فوقیت دی ہے اور بہت سارے اشعار اس موضوع پہ لکھے بھی ہیں۔ اقبال نے دانش نورانی سے اس قدر کام لیا ہے۔ اقبال کی ذاتی زندگی اور شاعری میں دانش نورانی کا اس قدر عمل دخل ہے کہ اقبال کی نظامِ فکر کو متعین کرنے میں دانش نورانی نے ہی مرکزی کردار ادا کیا ہے۔ اس ساری گُفت گو کو سمیٹتے ہوئے اور دانشِ نورانی کے ثمرات کا ذکر کرتے ہیں۔

''اقبال کی تجلیات'' کا پانچواں مضمون ''حالی اور اقبال کے مقامات آہ وفغاں'' کے عُنوان سے ہے۔ اس مضمون کو ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا ہے۔ سلیم اختر ہمارے اُردو ادب کے ان نقادوں میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے ہر صِنف کے ہر موضوع پر تنقید کی ہے۔ افسانہ، داستان، ناول، تحقیق، تدوین، اصطلاحات سازی اور تنقید سازی وغیرہ۔ اِس مضمون میں اُنھوں نے حالی کی مسدس کے حوالے سے اور اقبال کے ''شکوہ'' اور ''جوابِ شکوہ'' کے حوالے سے بصیرت افروز تنقید کی ہے اور اِن دونوں فن پاروں کے فِکری ابعاد اور فِکری اختلافات کو سامنے لانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ حالی اور اقبال کے فکری تقابل کو اس مضمون کا موضوع بنایا گیا ہے۔ شکوہ'' اور ''جوابِ شکوہ'' نظموں کے مقابل جب مسدس کا مطالعہ کیا جائے تو رجائیت کے مقابل قنوطیت اور مایوسی کے عناصر زیادہ ملتے ہیں۔ یہ عناصر کچھ اس لیے بھی در آئے ہیں کہ حالی کی طبیعت اور اقبال سے کم تر درجے کا تاریخی و سماجی شعور وغیرہ۔ مسدس حالی میں پائی جانے والی افسردگی کے بارے میں بات کرتے ہوئے سلیم اختر لکھتے ہیں:

> ''حالی نے مسدس سے افسردگی پھیلانے کے بعد ضمیمے کے اشعار میں قوم کو اُمید تو دلائی لیکن ان کے تحت الشعور میں حالات اور قوم سے جو ناامیدی تھی اس کی بنا پر وہ کسی لائحہ عمل پر اختتام کرنے کے برعکس مناجات بدر گاہِ قاضی الحاجات پر خاتمہ کرتے ہیں''(3)

حالی اور اقبال کی سیاسی و سماجی بصیرت اور فنی اپج میں بہت حد تک فرق تھا دونوں نے اگرچہ مسلمان قوم کے عروج و زوال کو موضوع بنایا؛ لیکن دونوں کے تخیل، سیاسی و سماجی شعور، بصیرت و بصارت کے فرق کی وجہ سے پیش کش کا انداز بہت حد تک بدل گیا ہے۔ دونوں کے فن پاروں میں موجود موضوع کے فرق کو بیان کیا ہے۔ یوں مجموعی طور پہ دیکھا جائے تو اس مضمون میں سلیم اختر نے اقبال اور حالی کے فن پاروں کا تنقیدی جائزہ لے کر ملی شاعری کے حوالے سے مماثلتیں اور تضادات ڈھونڈنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

''اقبال کی تجلیات'' کے چھٹے مضمون کا نام ''اقبال اور متعلمین اقبال'' ہے۔ اِس مضمون کو جناب قاضی عبد القادر نے لکھا ہے۔ بنیادی طور پر اس مضمون میں بڑے بڑے فلسفوں اور فلسفۂ اقبال کی شرح کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اقبال نے جن جن

فلسفیوں کا اثر قبول کیا اور جس طرح سے فلسفۂ اقبال کی شرح وبسیط کی گئی ان سب چیزوں کو بہت عمدہ طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔ یوں اور بھی بہت سارے فلسفیوں کی شرح جس طرح اقبال نے کی ہے یا اقبال کے شارحین نے کی ہے اس کا بھی بہت واضح بیان اس مضمون میں ملتا ہے۔

''اقبال کی تجلیات'' کے ساتویں مضمون کا عُنوان ''اقبال کی مثنویات'' ہے جس کو مشہور نقاد عبد الرحمٰن بجنوری نے لکھا ہے۔ مضمون ''اقبال کی مثنویات'' میں جہاں ایک طرف اُردو شاعری میں مثنوی کی صنف کی روایت کو بیان کیا گیا ہے ،وہاں ہی اقبال کی دو مثنویوں ''اسرار خُودی'' اور ''رموز بے خُودی'' کی اضافی خوبیوں کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ مثنوی ایک ایسی صنف ہے جو ہیئت کے ساتھ ساتھ موضوع کی وجہ سے بھی معروف ہے۔ اقبال کی ان دو مثنویوں میں بھی یہی ہیئت اور موضوع کی گنگا جمنی کیفیت ملتی ہے۔ یوں مجموعی طور پہ ہمیں اس کتاب کے تجزیے کے بعد بشیر احمد نحوی کی اس رائے سے اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ یہ سارے کے سارے مضمون اپنے اندر انفرادیت کے بے بہا پہلو لیے ہوئے ہیں۔ اس کتاب میں موجود مضامین کا مزاج اور مواد باقی مرتبہ کتب سے بہت حد تک مختلف ہے۔

''نفحاتِ اقبال'' اقبال کے فکر و فن پہ لکھے گئے مضامین پہ مشتمل بشیر احمد نحوی کی مرتب کردہ کتاب ہے، جس کو اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونی ورسٹی نے ۲۰۰۱ء میں شایع کیا۔ کتاب کے شروع میں پروفیسر بشیر احمد نحوی نے اِس کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ اس میں فکرِ اقبال کے چند ایسے نئے گوشے متعارف کروائے گئے ہیں جن سے عاشقانِ اقبال پہلے ناواقف تھے۔ کتاب میں شامل مضامین میں علامہ اقبال کی زندگی کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری اور فِکر کے کئی گوشوں پر بحث کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں ان مضامین کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہ ان صاحبانِ عقل و دانش نے لکھے ہیں جنہیں علامہ اقبال سے ملاقات کی سعادت کا شرف حاصل رہا ہے۔ ان میں نامور فلسفی اور مشہور اقبال شناس، معروف کتاب فکرِ اقبال کے مصنف ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم بھی شامل ہیں۔

اس کتاب میں درج ذیل مضامین شامل ہیں:

1. رسولِ پاک ﷺ سے محبت	سید عابد علی عابد
2. کلامِ اقبال کا حقیقی مقام	مولانا غلام رسول مہر
3. کلامِ اقبال کی شاعری اور قوتِ تحرک	محمد امین الاسلام
4. کلامِ اقبال میں عربی اَدب کے اثرات	پروفیسر محمد منور
5. اقبال	مجنوں گورکھ پوری
6. مسلمان کی زندگی اور اقبال	ڈاکٹر میر ولی الدین
7. اقبال اور حلاج	ایس۔ ایم۔ فاروق
8. بیسویں صدی کی دو شعری آوازیں	جیلانی کامران
9. اقبال: ایک رجائی شاعر	یوسف عزیز

10. علامہ اقبال سے میری ملاقات — ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم
11. اقبال ایک باپ کی حیثیت سے — ڈاکٹر جاوید اقبال
12. اقبال کی یاد میں — میاں بشیر احمد

''نفحاتِ اقبال'' کا پہلا مضمون بعنوان ''رسول ﷺ پاک سے محبت'' ہے جس کو سید عابد علی عابد نے لکھا ہے۔ اس مضمون میں اُردو اور فارسی شاعری میں رسول اکرم ﷺ سے محبت کی روایت میں جو شاعری کی گئی ہے اس کا بطور خاص ذکر کیا گیا ہے اور اِس ضمن میں اقبال کے شاعرانہ اختصاص کو بطور خاص دیکھا گیا ہے۔ یہ بات سچ ہے کہ باقی شُعرا نے بھی رسول اکرم ﷺ کی شان میں خُوب خُوب لکھا لیکن جو مقام اقبال کے حصّے میں آیا کسی اور کو نصیب نہیں ہوا۔ اِس کی وجہ اقبال کی محمد رسول اللہ ﷺ سے والہانہ محبت ہے وہ آپ کے عِشق میں غرق ہو کر اور قرآن کی نص کے مطابق آپ کی تعریف بیان کرتے ہیں۔

''نفحاتِ اقبال'' کے دُوسرے مضمون کا عُنوان ''کلامِ اقبال کا حقیقی مقام'' ہے، جس کو مولانا غلام رسول مہر نے لکھا ہے۔ مولانا غلام رسول مہر کلاسیکی شاعری اور اقبال کی شاعری کے بہت عمدہ شارح اور نقاد ہیں۔ اس مضمون میں انھوں نے کلامِ اقبال میں پیش کی جانے والی مستقبل کی پیش گوئیوں کا ذکر کیا ہے جو کہ بہت حد تک پوری بھی ہو چکی ہیں اور چند ایک جو مسلمانوں کے عروج کے بارے ہیں، ان کا پورا ہونا باقی رہ گیا ہے جو مولانا کے بقول پوری تو ہوں گی؛ لیکن اس کے لیے ہم مسلمانوں کو ساز گار حالات پیدا کرنے اور متحد ہونے کی ضرورت ہے۔ اقبال کی شاعری کا گہرائی سے اور عمیق مطالعہ کرنے والا ہر قاری اس حقیقت کو ضرور مانے گا کہ ان کی شاعری میں پوری دنیا کے سیاسی و سماجی اور عسکری حوالے سے ایسی پیش گوئیاں موجود ہیں، جن میں سے بہت ساری پوری ہو چکی ہیں اور کچھ ہونے والی ہیں۔ یہ اقبال کی نگاہ کی طاقت تھی۔ ان کی سیاسی و سماجی اور روحانی بصیرت تھی کہ انھوں نے آنے والے زمانے میں ہونے والی جنگوں کو بھی دیکھ لیا تھا اور انسان کی مستقبل کی تمام پریشاں حالیوں کا اَدراک کر لیا تھا۔ ''نفحاتِ اقبال'' کے تیسرے مضمون کا نام ''اقبال کی شاعری اور قوت و تحرک'' ہے۔ اس کو محمد امین الاسلام نے لکھا ہے۔ اِس مضمون میں محمد امین الاسلام نے اقبال کی شاعری میں قوت و تحرک اور عمل کی حرارت پیدا کرنے والے ذرائع کا خوش اسلوبی سے سراغ لگایا ہے۔ ان کے بقول اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت کی وجہ سے ہی اقبال کی شاعری میں تحرک و قوت پیدا ہوئی ہے۔

''نفحاتِ اقبال'' کے پانچویں مضمون کا عنوان ''کلام اقبال میں عربی ادب کے اثرات'' ہے۔ اس کے لکھاری پروفیسر محمد منور ہیں۔ اس مضمون میں عربی ادب اور عرب تہذیب و ثقافت کے اقبال کی شاعری پہ اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مضمون کے آغاز میں ہی محمد منور نے ہسپانوی مستشرق کی رائے میں یہ ثابت کیا ہے کہ پوری دنیا کی مسلم شاعری پہ کیسے عربی ادب و تہذیب کے اثرات شامل ہوئے۔ اقبال کے کلام میں یہ اثرات کیسے آئے محمد منور اس کی ابتدا مولوی میر حسن سے پڑھی جانے والی عربی کو بتاتے ہیں۔ یوں اس اقتباس سے پتا چلتا ہے کہ عربی ادب کے اثرات کی بڑی وجہ اقبال کا عربی ادب کا مطالعہ و ذوق اور پھر یہ کہ یہ زبان ان کے محبوب رسول ﷺ کی زبان ہے۔ اقبال نے بہت ساری نظموں میں اونچے

ٹیلوں، ریتلے میدانوں، شتر بانوں اور نخیلِ کارواں وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ اقبال کی شاعری پہ عربی ادب کے اثرات کے بارے میں بات کرتے ہوئے محمد منور لکھتے ہیں:

> ''وہ اس صحرا نشین شیر کے دوبارہ ہوشیار ہو جانے کی اُمید رکھتے ہیں جس نے پہلے کبھی صحرا سے نکل کر روما کے تخت کو الٹ دیا تھا۔ مگر یہ صریح باتیں ہیں، لطف وہاں آتا ہے جہاں وہ عرب کے ادبی روح کو اپنے شعروں میں سمو دیتے ہیں جہاں ان کی تشبیہیں، استعارے اور تلمیحیں اور خیالی تصویریں قاری کے ذہن کو عربی ماحول کی طرف منتقل کر دیتی ہیں۔''(4)

یوں ہم نے دیکھا کہ مرزا منور نے اقبال کی شاعری کے ایک ایسے گوشے کو بے نقاب کیا ہے، جس میں اقبال کی شاعری کی تقویت چھپی ہوئی ہے۔

''نفحاتِ اقبال'' کے چھٹے مضمون کا عنوان ''اقبال'' ہے۔ اِس مضمون کے لکھاری اُردو ادب کے معروف نقاد مجنوں گورکھ پوری ہیں۔ مجنوں پہلے تو اقبال کے فِکری و فنی اختصاص کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''ہمارے اَدب اور ہماری معاشرت کی تاریخ میں اقبال کا شمار ان دانایانِ راز میں ہو گا جو مستقبل کی جھلک دکھا کر فکر و عمل کا رخ نئی سمتوں کی طرف موڑ سکتے ہیں۔ اس سے تو کبھی بھی کسی کو انکار نہیں؛ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ یہی ان کی ساری شخصیت اور ساری حیثیت ہے اگر ہم ان کے فلسفے اور پیغام کو نظر انداز کر دیں یا کسی ایسے زمانے کا تصور کر سکیں جب کہ ان کے افکار و میلانات کا کوئی عنصر بھی زندہ نہ رہے گا، تو اس حالت میں ہم کو یہ ماننا پڑے گا کہ محض صناع اور شاعر کی حیثیت سے اقبال دنیا کے بڑے بڑے شاعروں کے ساتھ جگہ پا سکتے ہیں۔''(5)

اس کے بعد وہ اقبال کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت ان کا تغزل مانتے ہیں۔ اسی تغزل کو اور اقبال کی موسیقیت اور آہنگ کو نمایاں کر رہے ہیں۔ یوں ہم دیکھتے ہیں کہ اقبال کی شاعری کے دیگر فکری و فنی لوازم کے ساتھ ساتھ موسیقیت، آہنگ اور تغزل کو ان کی شاعری کا سب سے منفرد اور نمایاں وصف مانا گیا ہے دلیل کے طور پہ مجنوں نے کہا ہے کہ اقبال کی شاعری غزل سے شروع ہوئی انہوں نے گل و بلبل اور عارض و رخسار کے گیت نہ گاتے ہوئے بھی اپنی غزلیہ شاعری میں ایک مسحور کن تغزل دریافت کیا، یہی تغزل ان کی نظمیہ شاعری کی بھی پہچان رہا ہے۔ اقبال کے آہنگ اور تغزل کا مجنوں نے اُردو کے اور بھی چیدہ چیدہ شاعروں جیسا کہ غالب اور داغ وغیرہ سے تقابل کیا ہے اور اس نتیجے پہ پہنچے ہیں کہ اقبال کا ترنم ان کی موسیقیت اور تغزل میں جو روانی ہے وہ صرف انہی کی شاعری کا خاصہ ہے۔

''نفحاتِ اقبال'' کا ساتواں مضمون ''مسلمان کی زندگی اور اقبال'' ہے۔ اس کے مصنف ڈاکٹر میر ولی الدین ہیں۔ مصنف نے اقبال کے تصورِ مسلمان کو انہی کی شاعری سے اخذ کر کے پیش کیا ہے۔ مُسلمان وہ قوم ہیں جو قرآن کے مطابق دینِ محمدیہ ﷺ کے پیروکار ہیں۔ وہ دین یا مذہب جس کے اندر آنے کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ اقبال نے چوں کہ قرآن پاک کا بغور مطالعہ کیا ہوا تھا۔ اس لیے ان کا تصورِ مسلمان یا ان کے نزدیک جو ایک مثالی مسلمان ہے اس کی پہچان یہ ہے کہ وہ قرآن کے مطابق ہو۔ اب قرآن نے اس کی کیا نشانیاں بتائی ہیں یا قرآن سے اقبال نے کیا نشانیاں اخذ کی ہیں۔ یوں ہم دیکھتے ہیں کہ میر ولی الدین نے دو اصطلاحوں '' اندیشہ کمال'' اور ''جنوں'' کو بہت احسن طریقے سے بیان کر کے ایک مسلمان کی زندگی کو انہی دو اصطلاحوں کے گرد چکر لگاتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔

''نفحاتِ اقبال'' کے آٹھویں مضمون کا عنوان '' اقبال اور حلاج'' ہے۔ اس کے مصنف ایس۔ ایم۔ فاروق ہیں۔ حلاج مسلم تصوف کی تاریخ کا ایک بڑا کردار ہیں۔ بعض لوگوں نے اسے ولی کامل مانا ہے اور بعض نے شعبدہ باز، اقبال نے بھی حلاج کی زندگی کا اور ان کے افکار کا مطالعہ کیا ہوا تھا۔ وہ ساری زندگی ان کو وحدت الوجودی ولی ہی کہتے رہے۔ بہت بعد میں پھر اقبال کا رویہ ان کی طرف سے نرم ہو گیا تھا۔ اقبال کے پہلے پہل اس کے بارے میں جو خیالات تھے۔ بعد میں جب حلاج کے بارے اقبال کے رویے اور اَفکار میں تبدیلی آئی تو ان کے خیال کچھ اس طرح کے ہو گئے:

> ''تصوف کے ذریعے ہی اندرونی تجربے کا احساس ہوا جسے قرآن کریم نے علم کے تین ماخذ میں سے ایک قرار دیا۔''(6)

یوں ہم دیکھتے ہیں کہ حلاج جیسی متنازعہ شخصیت کو اقبال نے عمدہ سمجھا ہے۔ پہلے پہل جب ان کو لگا کہ یہ ''حلول'' کے قائل ہیں تو ان کا زاویۂ نظر کچھ اور تھا؛ لیکن جب ان کو لگا کہ حلاج عاشقِ خدا تھا تو انھوں نے حلاج کے بارے میں نرم رویہ اپنا لیا۔

''نفحاتِ اقبال'' کا نواں مضمون '' بیسویں صدی کی دو شعری آوازیں'' ہے جو کہ جیلانی کامران نے لکھا ہے۔ یہ مضمون برصغیر کی دو بڑی شعری آوازوں ٹیگور اور اقبال کے بارے میں ہے۔ ان دونوں شعرا نے ایک جیسے حالات میں ہی شاعری شروع کی، فطرت نگاری کے حوالے سے اشتراک کے کچھ پہلو بھی سامنے آتے ہیں لیکن بہت جلد دونوں شاعر دو مختلف فکری دھاروں پہ بہنے لگے۔ اس کے بعد وہ گیتان جلی کی شعری خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ اسی مضمون میں دونوں شُعرا کا تقابل کر کے اقبال کے بارے میں پیدا شدہ غلط فہمیوں کو دُور کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ یوں اس مضمون میں جیلانی کامران نے دو بڑے شعرا کا تقابل ان کی فِکری و فنی خوبیوں کے حوالے سے اور سیاسی و سماجی حالات کو ملحوظ رکھ کر کیا ہے۔

''نفحاتِ اقبال'' کا دسواں مضمون ''اقبال۔۔۔ ایک رجائی شاعر'' کے عنوان سے ہے۔ اس مضمون کو یوسف عزیز نے لکھا ہے۔ اس مضمون میں یوسف عزیز نے رجائیت اور قنوطیت کی تعریف متعین کر کے اقبال کی شاعری کو ان دونوں نظریات کے تناظر میں پرکھا ہے۔ رجائیت کی تعریف کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ:

''رجائیت کے مختصر معانی ہیں ''بہترین ممکنہ یا قابلِ تصور کیفیت'' بطور نظریہ اس کی جو تعریف کی گئی ہے وہ کچھ اس طرح ہے کہ ''واقعات و اعمال پر حسبِ رضا ایسی تعمیر کا میلان جس سے منفی زاویوں، کیفیات یا ممکنات کا تدارک ہو سکے۔'' آسان الفاظ میں، فطری طور پر خوش مزاج رہنے، زندگی کے بارے میں مثبت اور پر امید نقطۂ نظر رکھنے، اشیا و واقعات کے روشن پہلوؤں کو اختیار کرنے اور پیش آمدہ حالات و کیفیات سے مثبت مطابقت کے میلان کا نام رجائیت ہے۔''(7)

قنوطیت کی تعریف کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''قنوطیت کے لفظی معنی ''بدترین ممکنہ یا نا قابل تصور کیفیت'' کے ہیں اور اس کی یوں تعریف کی جا سکتی ہے: انسانی ہستی کے بارے میں نا اُمیدی اور یاسیت کا ایسا میلان جس کی بنیاد اس امر پر ہو کہ اشیا اور واقعات کا ہمیشہ منفی پہلو ان کے پیشِ نظر ہوتا ہے۔''(8)

درج بالا دونوں تعریفیں متعین کرنے کے بعد اور سیاسی و سماجی اور مسلمانوں کے نفسی محرکات کا جائزہ لینے کے بعد وہ اس نتیجے پہ پہنچتے ہیں کہ اقبال ایک رجائی شاعر ہیں اور ان کی شاعرانہ لے مردانہ ہے۔ اُردو شاعری میں رجائی اور قنوطی دونوں رویے غالب رہے ہیں، مثال کے طور پہ ولی دکنی رجائی شاعر تھے۔ میر رجائی نہ تھے کیوں کہ حالات و واقعات اس طرح کے تھے، اسی طرح مومن و غالب کے عہد میں صرف غالب رجائی تھے، بہادر شاہ ظفر رجائی نہ تھے۔ اقبال کے عہد میں بھی عالم اسلام پر آشوب دور سے گزر رہا تھا؛ لیکن اس کے باوجود وہ مایوس نہیں ہوئے اور انھوں نے امید و رجا کا ہی پیغام دیا۔ اس کتاب کے آخری تین مضامین ایک ہی نوعیت کے ہیں ان کا مزاج بھی ایک جیسا ہی ہے۔ ان مضامین کے عنوانات درج ذیل ہیں:

1. علامہ اقبال سے میری ملاقات	ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم
2. اقبال ایک باپ کی حیثیت سے	ڈاکٹر جاوید اقبال
3. اقبال کی یاد میں	میاں بشیر احمد

خلیفہ عبدالحکیم کا شمار ماہرینِ اقبالیات میں ہوتا ہے۔ اُنھوں نے زیادہ تر اقبال کے حوالے سے ان یادوں کا ذکر کیا ہے جب اقبال انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں جا جا کر اپنی نظمیں ترنم کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ خلیفہ عبدالحکیم نے بہت سارے ایسے واقعات کا ذکر کیا ہے جن سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں رہتا کہ اقبال اپنی شاعری کے سیاسی و سماجی اثرات کے ساتھ ساتھ اس میں پائے جانے والے تغزل آہنگ اور موسیقیت سے بخوبی آشنا تھے۔ ان کو اس چیز کا مکمل ادراک تھا کہ کون سی نظم یا فن پارہ ترنم کے ساتھ پڑھنا ہے اور کون سا فن پارہ تحت اللفظ کے ساتھ پڑھنا ہے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال علامہ

اقبال کے بیٹے ہیں اور منیرہ کے بھائی اس مضمون میں جاوید اقبال نے افسانوی انداز میں اپنے ساتھ والد محترم کی محبت کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ ان کی والدہ کی وفات کے بعد ان کے والد محترم ان سے زیادہ محبت کرنے اور دونوں بہن بھائیوں کو ماتھے پہ بوسہ بھی دینے لگے۔ زندگی کی ہر اونچ نیچ ان کو سمجھاتے۔ جاوید اقبال کو پہناوے کے متعلق خصوصی ہدایت جاری فرماتے۔ اپنے ساتھ محافل میں ضرور بٹھاتے چاہے جاوید اقبال کو اس دوران کوئی فائدہ ہوتا تھا یا نہیں۔ جاوید اقبال نے اپنے باپ کی وفات کا ذکر بھی افسانوی انداز میں کیا ہے۔

''نفحاتِ اقبال'' کا آخری مضمون ''اقبال کی یاد میں'' کے عنوان سے ہے جس کو میاں بشیر احمد نے لکھا ہے اس مضمون میں بھی اقبال کے متعلق یادوں کے دریچے وا ہوتے ہیں۔ مصنف موصوف کے والد سے اقبال کا یارانہ تھا تو اس دوران مصنف کو جب جب اقبال سے گُفت گُو کا موقع ملا ان واقعات کی چیدہ چیدہ یادوں کو نقل کیا ہے۔ یوں اس پورے باب کے تنقیدی مطالعہ کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ بشیر احمد نحوی نے اقبال کی تفہیم و تعبیر کے لیے خود تو حصہ لیا ہی تھا، باقی جو کتب مرتب بھی کی ہیں ان میں بھی خاص زاویۂ نظر ملحوظ رکھا ہے۔ بشیر نحوی نے اُردو ادب کے ان ناقدین کے مضامین منتخب کیے ہیں جو اپنی ذات میں اعتبار کا درجہ رکھتے ہیں اور اقبالیات کے میدان میں بھی ان کے مضامین نایاب ہیں۔ بشیر نحوی کی تنقید اور ان کے منتخب کردہ مضامین سے اقبال کی فکری و فنی خصوصیات کو سمجھنے کی قوت ملتی ہے۔

پروفیسر بشیر احمد نحوی کی مرتبہ کتاب ''اقبالیات۔۔۔ گزشتہ دس سال (تحقیقی و تنقیدی جائزہ)'' کے عنوان سے ہے، اس کتاب کو اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونی ورسٹی نے ۲۰۰۴ء میں شایع کیا۔

اس کتاب میں درج ذیل مضامین شامل ہیں:

1. پیش لفظ — پروفیسر بشیر احمد نحوی
2. دربادۂ امروزم کیفیتِ فردا ہیں — پروفیسر عبدالحق
3. بھوپال میں اقبالیات — پروفیسر آفاق احمد
4. اقبال انسٹی ٹیوٹ کے معیاری سلسلۂ مطبوعات کی ایک روشن کڑی پروفیسر حامدی کاشمیری کی کتاب ''اقبال کا تخلیقی شعور''

پروفیسر مرغوب بانہالی

5. مطالعۂ اقبال: چند نئے زاویے۔ ایک جائزہ — پروفیسر ظہور الدین
6. آلِ احمد سرور کی اقبال شناسی۔ ایک جائزہ — پروفیسر علی احمد فاطمی
7. بشیر احمد نحوی کی اقبال شناسی ''مسائلِ تصوف اور اقبال'' کے حوالے سے — پروفیسر قدوس جاوید
8. پیرِ مغرب شاعرِ المانوی (''اقبال اور گوئٹے'' کے موضوعِ پر انگریزی میں تحریر شدہ کتاب پر ایک اجمالی تبصرہ)

پروفیسر بشیر احمد نحوی

9. اقبال انسٹی ٹیوٹ کی چند مطبوعات کا جائزہ — ڈاکٹر تسکینہ فاضل
10. شعبۂ اُردو دہلی یونی ورسٹی میں اقبالیاتی سرگرمیاں — ڈاکٹر توقیر احمد خان
11. ''اقبالیات کا تنقیدی جائزہ'': ایک تاثر — ڈاکٹر شہاب عنایت ملک
12. جموں و کشمیر میں اقبالیات کا جائزہ: اداروں کی خدمات — ڈاکٹر محمد اسد اللہ وانی
13. عرش و کشمیر کے اعداد بر ابر نکلے ''باقیات اقبال'' کے حوالے سے ایک تنقیدی جائزہ — س۔م۔اندرابی
14. کشمیر میں مطالعۂ اقبالیات کا ایک جائزہ (اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونی ورسٹی کے حوالے سے) — ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی

''اقبالیات۔۔۔ گزشتہ دس سال (تحقیقی و تنقیدی جائزہ)'' کا دوسرا مضمون ''در بادۂ امروزم کیفیت فردہ بیں'' کے عنوان سے ہے۔ اس کے لکھاری پروفیسر عبدالحق ہیں۔

''اقبالیات۔۔۔ گزشتہ دس سال (تحقیقی و تنقیدی جائزہ)'' کا تیسرا مضمون ''بھوپال میں اقبالیات'' کے عنوان سے ہے، جس کو پروفیسر آفاق احمد نے لکھا ہے۔ اس مضمون میں پروفیسر آفاق احمد نے پہلے تو اقبال اور بھوپال کا تعلق بتایا ہے اور تاریخی حقائق کو مدِ نظر رکھتے ہوئے بتایا ہے کہ کس کس تاریخ کو اقبال بھوپال تشریف لائے اور اہل بھوپال نے ان کو کس طرح تعظیم و تکریم دی۔ پہلے وہ بھوپال سے اقبال کے تعلق پہ روشنی ڈالتے ہیں۔ اس کے بعد عبدالحق نے بھوپال میں ہونے والے اس کام کا جائزہ لیا ہے، جو اقبال پر مختلف حوالوں سے ہوا ہے اور جس کے ذریعے بہت سارے ناقدین اور محققین نے فکرِ اقبال کی بہت ساری نادر جہات کو دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔ یوں ہم دیکھتے ہیں کہ اس مضمون میں ریاستِ بھوپال میں اقبال شناسی کی روایت اور اقبال شناسی کے مختلف گوشوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

''اقبالیات۔۔۔ گزشتہ دس سال (تحقیقی و تنقیدی جائزہ)'' کے چوتھے مضمون کا عنوان ''اقبال۔انسٹی ٹیوٹ کے معیاری سلسلہ مطبوعات کی ایک روشن کڑی پروفیسر حامدی کاشمیری کی کتاب ''اقبال کا تخلیقی شعور'' کے عنوان سے ہے۔ اس مضمون کے لکھاری پروفیسر مرغوب بانہالی ہیں، جن کا اپنا شمار بھی ماہرینِ اقبالیات میں ہوتا ہے۔

پروفیسر مرغوب بانہالی نے پہلے تو اقبالیات کے حوالے سے اس ادارے کی خدمات کا ذکر کیا ہے اور باقی اداروں سے جو کہ اقبالیات کے حوالے سے کام کر رہے ہیں اس ادارے کی انفرادی خصوصیات کو نمایاں کیا ہے۔

پروفیسر بانہالی نے بہت عمدہ طریقے سے اس کتاب کے مندرجات سے لے کر تمام مباحث کا نچوڑ اس مضمون میں بیان کیا ہے۔ مجموعی طور پر اس کتاب میں اقبال پہ لکھی گئی کتب کی تنقیدی نوعیت پہ بحث ہے جس میں مصنف موصوف کا رویہ بھی بعض اوقات معتدل نہیں رہ سکا تو اس رویے کی نشان دہی بھی پروفیسر بانہالی نے کی ہے۔

''اقبالیات۔۔۔ گزشتہ دس سال (تحقیقی و تنقیدی جائزہ)'' کے پانچویں مضمون کا عنوان ''مطالعۂ اقبال: چند نئے زاویے'' ایک جائزہ'' ہے۔ یہ مضمون پروفیسر ظہور الدین نے لکھا ہے اور اس میں اقبال پہ لکھی جانے والی سید سراج الدین کی کتاب ''مطالعۂ اقبال چند نئے زاویے'' کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ مصنف کے بقول اب وہ صرف اقبال پہ وہی کتاب پڑھنا پسند کرتے ہیں

جس میں فکرِ اقبال کے بارے کچھ نیا ملے کیوں کہ اب لکیر پیٹنے اور مکھی پہ مکھی مار کر ماہرین اقبالیات بننے کا رواج چل نکلا ہے۔

سید سراج الدین کی یہ کتاب اپریل ۲۰۰۰ء میں شایع ہوئی۔ اس میں مصنف کے بقول کچھ نیا تھا۔ اس لیے وہ اس کی طرف راغب ہوئے۔ اس کے بعد وہ اس کتاب کے مشمولات کی فہرست کا بتاتے ہیں۔ پروفیسر ظہور الحق نے متذکرہ کتاب میں سے سات مندرجات پہ بات کی ہے اور اس کا مدلل تجزیہ کیا ہے۔ پہلے مضمون کا عنوان ''اقبال غلط فہمی کا شکار ایک عالمی شاعر'' ہے۔ اس مضمون میں مصنف نے اقبال کی شاعری کے بارے پائی جانے والی غلط فہمیوں کا ذکر کیا ہے۔ لوگوں کی من گھڑت باتوں کا مدلل جواب دیا ہے۔ اسی طرح ایک اور مغالطہ دور کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''اقبال کے افکار سے ذرا سی واقفیت بھی اس بات کو سمجھنے کے لیے کافی ہے کہ اقبال کے نظریات خُودی و قوت اور گاندھی جی کے نظریۂ عدم تشدد میں کوئی قدر مشترک نہیں تھی اور جواہر لعل کی دہریت آمیز اشتراکیت اقبال کے لیے ناقابل قبول تھی۔ اقبال نے کسی موقع پر پاکستان کے تصور کو جواہر لعل نہرو کی دہریت پسند اشتراکیت کا جواب کہا تھا۔ گویا پاکستان کا نظریۂ ان کے نزدیک صرف ایک سیاسی لائحہ عمل نہیں تھا بل کہ ایک اخلاقی اور روحانی نصب العین کا درجہ رکھتا تھا۔۔۔ اسی لیے ان کے ذہن میں یہ خیال ابھرا کہ ممکن ہے برصغیر کے ایک گوشے میں وہ نظام وجود میں آسکے جو اسلامی انصاف اور انسانیت کے عالمی اقدار کو بروئے کار لائے۔ گویا پاکستان کا قیام اقبال کے لیے مذہبی خطوط پر مبنی ملک کی تقسیم نہیں تھا بل کہ ایک خیال، ایک خواب کی تشکیل و تکمیل تھا۔''(9)

''اقبالیات۔۔۔ گزشتہ دس سال (تحقیقی و تنقیدی جائزہ)'' کے ساتویں مضمون پہ بات کرتے ہوئے جس کا عنوان ''اقبال کی اُردو غزل'' ہے۔ پروفیسر ظہور الدین نے اقبال کی غزل اور اس کے دریافت شدہ تغزل پہ بات کی ہے۔ سید سراج الدین کی لکھی گئی کتاب کا مجموعی جائزہ لینے کے بعد پروفیسر ظہور الدین اس نتیجے پہ پہنچے ہیں کہ:

> ''پیش کی گئی تصریحات سے یہ بات واضح ہو چکی ہو گی کہ پروفیسر سید سراج الدین نے اگرچہ کوئی ایسی بات نہیں کہی ہے جسے ان سے قبل کسی نے کہا ہو پر اتنا ضرور ہے کہ ان باتوں سے اُنھوں نے جو نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی ہے اُن کی انفرادیت یقیناً جھلکتی ہے۔ اس مجموعے کے بقیہ مضامین میں بھی ہمیں یہ بہ خوبی دکھائی دیتی ہے۔ چناں چہ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ ان مضامین سے تفہیمِ اقبال کے جو زاویے سامنے آتے ہیں ان سے غور و خوض کی نئی

کونپلوں کے پھوٹنے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ یہی اس مجموعے کی کام
یابی کا راز بھی ہے۔''(10)

یوں مجموعی طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ سید سراج الدین نے اپنی کتاب ''مطالعۂ اقبال۔ چند نئے زاویے'' میں جن نکات کو اُبھارا ہے، وہ سارے کے سارے نکات پروفیسر ظہور الدین کے ملحوظ رہے ہیں۔

اس کتاب کا چھٹا مضمون ''آل احمد سرور کی اقبال شناسی۔ ایک جائزہ'' کے عنوان سے ہے۔ اس مضمون میں پروفیسر علی احمد فاطمی نے آل احمد سرور کی اقبال پہ لکھی جانے والی تنقید کا جائزہ لیا ہے۔ اور آل احمد سرور کے تنقیدی رویوں کا اقبال شناسی کے حوالے سے خصوصی ذکر کیا ہے۔ انھوں نے اس مضمون میں آل احمد سرور کی اقبال پہ لکھی گئی تنقید کا دوسرے نقادوں کی اقبال پہ لکھی گئی تنقید سے تقابل بھی کیا ہے۔ عام طور پہ بہت سارے ناقدین فکرِ اقبال میں اس قدر الجھ جاتے ہیں کہ اقبال کے فن یا اقبال کے نظریۂ شعر پہ بہت کم بات ہوتی ہے؛ لیکن آل احمد سرور نے اس حوالے سے متوازن رویہ اپنایا۔ اس مضمون میں علی احمد فاطمی نے سرور کی اقبال پہ کی جانے والی تنقید کا تو تجزیہ کیا ہی ہے، ساتھ ساتھ سرور کی تنقید نگاری پہ اٹھنے والے اعتراضات کا بھی جائزہ لیا ہے اور آخر میں سرور کا بطور نقاد قد کاٹھ متعین کیا ہے۔

'' اقبالیات۔۔۔ گزشتہ دس سال (تحقیقی و تنقیدی جائزہ)'' کے ساتویں مضمون کا عنوان ''بشیر احمد نحوی کی اقبال شناسی (مسائل تصوف اور اقبال)'' کے حوالے سے ہے۔ اِس مضمون کو پروفیسر قدوس جاوید نے لکھا ہے۔ تصوف اقبال کی شاعری کا ایک بڑا موضوع رہا ہے۔ تصوف اُردو کی کلاسیکی شاعری کا بھی بہت بڑا موضوع رہا ہے۔ اقبال نے تصوف کا جو تصور دیا وہ انسان کو تحرک اور صلابت بخشتا ہے اور رہبانیت سے دور کوشش و عمل کی وادیوں میں لے جاتا ہے جب کہ تصوف کی عجمی روایت انسان کو بے عمل سست اور کاہل بناتی ہے۔ بشیر احمد نحوی ایک ایسے ماہرِ اقبال ہیں جنھوں نے اقبال کے اس موضوع کو بہت باریک بینی سے دیکھا ہے۔ انھوں نے تصوف کے ان تمام نظریات کی تردید کر دی ہے جو کہ انسان کے فکر و عمل پہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ بشیر احمد نحوی نے اپنی تمام کتب میں بلواسطہ یا بلاواسطہ تصوف کے موضوع پر لکھا ہے۔ ان کی خدمات کو سراہتے ہیں۔

'' اقبالیات۔۔۔ گزشتہ دس سال (تحقیقی و تنقیدی جائزہ)'' کا آٹھواں مضمون '' پیر مغرب شاعر المانوی (اقبال اینڈ گوئٹے۔۔ کے موضوع پر انگریزی میں تحریر شدہ کتاب پر ایک اجمالی تبصرہ)'' کے عنوان سے ہے اور اس مضمون کے لکھاری بشیر احمد نحوی ہیں۔ اس مضمون میں بشیر احمد نحوی نے اقبال اور گوئٹے کے فکری اشتراکات پہ روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ اقبال گوئٹے کے افکار سے بہت متاثر تھے اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ گوئٹے حضرت محمد ﷺ کی ذاتِ اقدس سے محبت کرتے تھے۔ ان کا بہت احترام کرتے تھے تو انھوں نے اسی وجہ سے مشرقی تہذیب میں دل چسپی لینی شروع کر دی۔ اقبال نے بھی اس کے جواب میں پوری شاعری کی کتاب لکھ ڈالی۔ اقبال کس حد تک گوئٹے کے افکار اور شاعری سے متاثر تھے۔ گوئٹے سے اقبال کی عقیدت اور فکری انسلاکات کا بنیادی محرک بھی گوئٹے کا اسلام میں دل چسپی کا

نتیجہ ہی تھا۔ یوں مجموعی طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ کس طرح اقبال نے مغربی مفکرین سے اپنی فکری صلابت کے مختلف عناصر کو کشید کیا ہے۔

''اقبالیات۔۔۔ گزشتہ دس سال (تحقیقی و تنقیدی جائزہ)'' کے نویں مضمون کا عنوان ''اقبال انسٹی ٹیوٹ کی چند مطبوعات کا جائزہ'' ہے، جس کی مصنفہ ڈاکٹر تسکینہ فاضل ہیں۔ اس مضمون میں تسکینہ فاضل نے اقبال انسٹی ٹیوٹ کی چند نام ور اور ممتاز کتب کا ذکر کیا ہے۔ ویسے تو اقبال پہ لکھی گئی کتابوں کا شمار نہیں ہے کیوں کہ اقبالیات ایک ایسا موضوع ہے جس کی آفاقی فکر پہ لکھنے کی گنجائش ہمیشہ موجود رہے گی۔ ڈاکٹر تسکینہ فاضل نے صرف اقبال انسٹی ٹیوٹ کے تحت لکھی جانے والی کتب سے ہی آغاز نہیں کیا بل کہ اقبال کی زندگی میں ہی ان پہ لکھی جانے والی کتب سے آغاز کیا ہے ابتدا سے بات شروع کر کے وہ اقبالیات کی ان کتب کا ذکر کر رہی ہیں جن کو اقبالیات کا تنقیدی ستون مانا جاتا ہے۔ ان کتب میں مشہور ناقدین اور ماہرینِ اقبالیات کی کتب کا ذکر موجود ہے۔ اس حوالے سے وہ چند کتابوں کی فہرست دیتی ہیں جو کہ درج ذیل ہیں:

''گزشتہ دس برسوں یعنی 1993ء سے لے کر 2002ء تک ہندو پاک میں اقبال پر
جو کتابیں شایع ہو چکی ہیں، ان میں بعض کے نام اس طرح ہیں:

1. جہانِ اقبال	سید معین الرحمٰن، 1997ء
2. اقبال اور دانتے	ڈاکٹر منظر حسین، اگست 1998ء
3. دانشورِ اقبال	پروفیسر آلِ احمد سرور، 1994ء
4. اقبال کی منتخب نظمیں اور غزلیں	پروفیسر اسلوب احمد انصاری، 1994ء
5. تفکرِ دینی پر تجدید نظر (اقبال)	ترجمہ ڈاکٹر محمد سمیع الحق، 1994ء
6. اقبالیات نذیر نیازی	پروفیسر عبد اللہ شاہ ہاشمی، 1996ء
7. اقبال۔ شاعر اور سیاست دان	ڈاکٹر رفیق زکریا، 1995ء
8. اقبال اور قومی یک جہتی	ڈاکٹر منظر اعجاز، جون 1994ء
9. اقبال کا حرفِ تمنا	پروفیسر شمیم حنفی، 1996ء
10. اقبال۔ فن اور فلسفہ	نور الحسن نقوی، 1999ء
11. خطبات اقبال۔ ایک جائزہ	محمد شریف بقا، 1994ء
12. ذکرِ اقبال	عبد المجید سالک، 1993ء

اور جناب بدیع الزماں کی چھ کتابیں۔''(11)

علاوہ ازیں اُنھوں نے ممتاز اور نام ور ماہرینِ اقبال کی ساری کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ ان کتابوں کا خاص طور پہ مذکور ہے جن میں اقبال کے افکار و فن کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے اور جن میں فکرِ اقبال کے متنوع گوشے منور کرنے کی کوشش کی گئی

ہے۔ ان ممتاز ماہرینِ اقبال میں خلیفہ عبد الحکیم، یوسف حسن خان، رفیع الدین ہاشمی، خواجہ زکریا، ڈاکٹر فخر الحق نوری، مجنوں گورکھ پوری، علی سردار جعفری، حامدی کاشمیری، گیان چند جین، سید عابد علی عابد کے نام معروف ہیں۔

'' اقبالیات۔۔۔ گزشتہ دس سال (تحقیقی و تنقیدی جائزہ)'' کے دسویں مضمون کا عنوان ''شعبۂ اُردو دہلی یونی ورسٹی میں اقبالیاتی سرگرمیاں'' کے عنوان سے ہے۔ اس مضمون کو ڈاکٹر توقیر احمد خان نے لکھا ہے۔ توقیر احمد خان نے دہلی شہر سے اقبال کی وابستگی کی وجوہات بتائی ہیں اور ساتھ ساتھ ان کے اشعار کے حوالے بھی دیے ہیں۔ مضمون کے آغاز سے ہی ان ہستیوں کا ذکر ہمیں دیکھنے اور پڑھنے کو ملتا ہے، جن ہستیوں کی یاد میں اقبال نے شاعری کی اور ساتھ میں دہلی کا ذکر بھی آ گیا۔ اس ضمن میں اُنھوں نے غالب اور داغ کے بارے میں لکھے گئے اقبال کے اشعار کا خصوصی حوالہ دیا ہے۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ کا ذکر بھی اسی ضمن میں کیا گیا ہے۔ ان ہستیوں پہ اشعار کہتے ہوئے اقبال نے دہلی کا ذکر بھی بہت خلوص سے کیا ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے اس امر کی طرف بھی خصوصی اشارہ کیا ہے کہ اقبال کی وفات کے بعد جس شہر سے سب سے پہلا پرچہ اقبال کے بارے نکلا، وہ دہلی شہر ہی تھا کہ وہاں سے رسالہ ''جوہر'' نکلا جس کو خواجہ غلام السیدین نے نکالا تھا۔ اس کے بعد مضمون کے اگلے حصے میں توقیر احمد خان نے دہلی شہر کی اس معروف تعلیمی درس گاہ سے اقبال پر ہونے والی تحقیقی سرگرمیوں اور اقبالیات کے موضوع پہ شایع ہونے والی کتب کا جائزہ پیش کیا ہے اور اقبالیات کی روایت میں ان کتب کا مقام و مرتبہ بھی متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے پروفیسر عبد الحق کا اس مضمون میں بہ طور خاص ذکر کیا ہے کیوں کہ ماہرین اقبال کی صف میں ان کا مقام بہت نمایاں اور اعتبار بخش ہے۔ اقبالیات کے حوالے سے عبد الحق کا بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ''شذرات اقبال'' یعنی Stray Reflection کتاب کا ترجمہ اُردو زبان میں ''بکھرے خیالات'' کے عنوان سے کیا۔ علاوہ ازیں ہندوستان کی بہت ساری جامعات میں اقبالیات کے موضوع پر منعقدہ سیمینار پہ پڑھے جانے والے مقالات کو کتابی شکل میں شایع کیا۔ اس حوالے سے ان کی تین مشہور کتب کا ذکر توقیر احمد خان نے اپنے اس مضمون میں کیا ہے۔ ان کی پہلی کتاب ''اقبال کی شعری و فکری جہات'' ہے جو کہ ۱۹۹۷ء میں شایع ہوئی جب کہ '' اقبال کے شعری اسالیب'' کے عنوان سے کتاب ۱۹۸۸ء میں شایع ہوئی اور '' فکرِ اقبال کی سرگزشت'' کے عنوان سے کتاب ۱۹۹۸ء میں شایع ہوئی۔ یہ تینوں کتب مرتبہ ہیں۔ پہلی دو کتب میں باقی ناقدین کے مضامین ہیں۔ ان ناقدین کا تعلق ہندوستان سے بھی ہے اور پاکستان سے بھی؛ لیکن آخری کتاب صرف اور صرف عبد الحق کے تنقیدی مضامین پہ مشتمل ہے جو کہ بکھری ہوئی حالت میں تھے جن کو ایک ساتھ کر کے کتابی شکل میں شایع کیا گیا ہے۔

'' اقبالیات۔۔ گزشتہ دس سال (تحقیقی و تنقیدی جائزہ)'' کے گیارہویں مضمون کا عنوان ''اقبالیات کا تنقیدی جائزہ۔۔۔ ایک تاثر'' ہے۔ اس مضمون کے لکھاری ڈاکٹر شہاب عنایت ملک ہیں۔ اس مضمون میں ڈاکٹر شہاب ملک نے اقبال کی فکر کا تعارف بہت بلیغ انداز سے کرایا ہے اور یہ بتایا ہے کہ کن حالات میں فکر اقبال کی پرداخت کا سہرا وادی کے ناقدین نے اپنے سر لیا تھا۔

یہ کتاب ''اقبالیات کا تنقیدی جائزہ'' بھی وادی کے ماہرینِ اقبال کی کاوشوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ درج بالا کتاب در اصل شعبۂ اُردو جموں یونی ورسٹی میں منعقدہ سیمینار میں پڑھے گئے مقالہ جات کی شایع شدہ کتاب کا نام ہے۔ ڈاکٹر شہاب عنایت نے چیدہ چیدہ مضامین کی خوبیوں کو بیان کیا ہے۔ اس طرح اور بھی بہت سارے مضامین کا تعارف کروانے کے ساتھ ساتھ انھوں نے اس مضمون کے محاسن و معائب پہ خُوب لکھا ہے۔ مضمون کے آخر میں وہ ان مضامین کے بارے کلی طور پہ رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''کل ملا کر یہ مجموعہ اقبال شناسی میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے جس سے اقبال پر کام کرنے والوں کے لیے تحقیق کے مزید دروازے وا ہوتے ہیں۔''(12)

''اقبالیات۔۔۔ گزشتہ دس سال (تحقیقی و تنقیدی جائزہ)'' کے بارہویں مضمون کا عنوان ''جموں و کشمیر میں اقبالیات کا جائزہ۔ اداروں اور انجمنوں کی خدمات'' ہے۔ جیسا کہ اس عنوان سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ انجمنیں اور ادارے جو ریاست جموں و کشمیر میں اقبالیات کے شعبے میں کام کر رہے ہیں انھوں نے کس طرح سے اقبال کی تفہیم کی روایت کو وقیع بنایا۔ ان اداروں نے ادبی سطح پہ بہت ساری خدمات انجام دی ہیں۔ اس مضمون کے لکھاری ڈاکٹر محمد اسد اللہ وانی نے ان اداروں اور انجمنوں کی خدمات اور مقاصد کا جائزہ لیا ہے۔ اس حوالے سے انھوں نے سب سے پہلے جس ادارے کا نام لیا ہے اور جس ادارے کی خدمات کا ذکر کیا ہے وہ بزم اقبال، سری نگر ہے جو کہ اقبالیات کے حوالے سے باقاعدہ نشستیں منعقد کراتی رہی ہے جس میں بہت بڑے بڑے ماہرینِ اقبالیات نے خدمات سر انجام دی ہیں۔ اقبال اکادمی سری نگر بھی ایسا ادارہ ہے جو کہ تفہیمِ اقبال کی تبلیغ کے لیے پیش پیش ہے۔ اس ادارے کا قیام ۹ نومبر ۱۹۶۸ء کو عمل میں آیا، جس کا مقصد اقبال کے فکر و فن کو صحیح تناظر میں پیش کرنا تھا۔ یہ ادارہ ہر سال اقبال کے حوالے سے ادبی محافل بھی منعقد کرواتا ہے جو کہ نو نومبر اور اکیس اپریل کو عام طور پہ ہوتی ہیں۔ اس اکیڈمی کی بہت ساری مطبوعات ایسی بھی ہیں جو کہ اقبالیات کی روایت میں بلند درجہ رکھتی ہیں ان میں چند ایک یہ ہیں:

1۔ حکیم مشرق	مرتب: ڈاکٹر بشیر احمد نحوی
2۔ بیادِ شوریدہ کاشمیری	مرتبین: ڈاکٹر غلام رسول ملک / ڈاکٹر بشیر احمد نحوی
3۔ چشمۂ آفتاب	مرتبین: ڈاکٹر غلام رسول ملک / ڈاکٹر بشیر احمد نحوی
4۔ خواجہ محمد امین بچھ (اقبال کا شیدائی)	مرتبین: ڈاکٹر غلام رسول ملک / ڈاکٹر بشیر احمد نحوی
5۔ آئینۂ ادراک	پروفیسر حامدی کاشمیری

جموں کشمیر کلچرل اکیڈمی کی بنیاد ۱۹۵۸ء میں رکھی گئی۔ یہ اقبال کے پیغام کی ترویج ایک خاص زاویے سے کرتی ہے۔ مثال کے طور پہ اقبال صدی تقاریب کمیٹی اپنے انداز سے فکر اقبال کی تبلیغ کرتی ہے۔ علاوہ ازیں اقبال مباحثے بھی کراتی ہے جن کا بنیادی مقصد کالج کی سطح تک اقبال کے پیغام کی تشہیر ہوتا ہے۔ اس اکیڈمی کے توسل سے کلامِ اقبال کے حوالے سے

موسیقی کے کئی ایک پروگرام اور مقابلہ جات بھی منعقد ہوتے ہیں۔ طرحی مشاعرے بھی منعقد کیے جاتے ہیں، ساتھ ساتھ مصوری کے مقابلے بھی ہوتے ہیں۔ سیمینار بھی منعقد کیے جاتے ہیں۔ اس ادارے کی درج ذیل معروف کتب بھی ہیں جن کی اشاعت اقبالیات میں اہم اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں:

1۔ محفلِ اقبال (اُردو مقالات)	مرتبین: رشید نازکی / محمد اسد اللہ
2۔ پرتو اقبال (کشمیری تراجم)	مرتبین: رشید نازکی / محمد احسن احسن
3۔ پیامِ مشرق (کشمیری تراجم)	سلطان الحق شہیدی
4۔ زرژہلم (کشمیری تراجم)	محمد امین کامل
5۔ شیرازہ اُردو (اقبال نمبر)	مرتب: رشید نازکی
6۔ شیرازہ اُردو (اقبال نمبر، دوسرا ایڈیشن)	مرتب: محمد احمد اندرابی
7۔ اقبال نامہ (شیرازہ کشمیری / اقبال نمبر)	مرتب: محمد امین کامل
8۔ شیرازہ ہندی (اقبال نمبر)	مرتب: رمیش مہتہ
9۔ شیرازہ پنجابی (اقبال نمبر)	مرتب: امریک سنگھ
10۔ شیرازہ ڈوگری (اقبال نمبر)	مرتب: اوم گوسوامی

ان اداروں کے ساتھ ساتھ درج ذیل جامعات اور ان کے اُردو شعبۂ جات خاص طور سے فکر اقبال کی تفہیم و ترویج میں کوشاں ہیں، جن میں کشمیر یونی ورسٹی شعبۂ اُردو جموں یونی ورسٹی وغیرہ۔ اس طرح کے ادارے مختلف سیمینار بھی منعقد کرواتے ہیں تو سیمی لیکچرز کا اہتمام بھی کرتے ہیں۔ یہ ادارے بہت سارے ماہرین کو بھی مدعو کرتے ہیں اور بہت سارے پروگرام بھی اس طرح کے منعقد کرواتے ہیں جس سے اقبال کی فِکر کی آفاقی جہات سامنے آتی ہیں۔ انہی اداروں کی بدولت اقبال جیسے بڑے شاعر کی فکر کو وُقعت بھی مل رہی اور اِس فکر کے نئے زاویے بھی سامنے آرہے ہیں۔

''اقبالیات۔۔۔ گزشتہ دس سال (تحقیقی و تنقیدی جائزہ)'' کے تیرہویں مضمون کا عنوان ''عرش و کشمیر کے اعداد برابر نکلے'' باقیات اقبال کے حوالے سے ایک تحقیقی مقالہ ہے۔ اس کے لکھاری س۔م۔ اندرابی ہیں جو کہ کسی یونی ورسٹی میں پی ایچ۔ڈی کے اسکالر ہیں۔ اس مضمون میں مصنف نے بتایا ہے کہ کس طرح ان کی یونی ورسٹی میں اقبال پہ کوئی سیمینار تھا۔ ان کے پروفیسر نے ان کو بھیجا کہ پروفیسر علی احمد فاطمی کو لے آؤ، یہ لینے گئے تو ان کی پروفیسر سے ملاقات ہوئی، وہ بھی اقبال شناس تھے اور مصنف موصوف کو بھی اقبالیات سے خاصا شغف تھا۔ پھر پروفیسر بشیر احمد نحوی سے متاثر ہو کر بھی مصنف نے اقبالیات کے گوشے میں قدم رکھا۔ ان دونوں پروفیسر حضرات کے مشورے سے لکھاری نے باقیات اقبال پہ مضمون لکھنے کا ارادہ کر لیا اور دلائل سے یہ ثابت کیا کہ باقیات اقبال میں جو کلام ہے وہ بھی ان کے شایع شدہ کلام جتنا ہی وقیع ہے اور اس کی بھی اتنی ہی اہمیت ہے۔

''اقبالیات۔۔۔ گزشتہ دس سال (تحقیقی و تنقیدی جائزہ)'' کا بار ہواں اور آخری مضمون ''کشمیر میں مطالعۂ اقبالیات کا ایک جائزہ'' ہے، جس کے مصنف ڈاکٹر مشتاق گنائی ہیں۔ اس مضمون میں کشمیر میں اقبالیات کے حوالے سے ہونے والے مطالعہ کی نوعیت کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ادب و شعر سے تعلق رکھنے والا ہر قاری اس حقیقت سے واقف ہے کہ اقبال کشمیر سے کیا تعلق رکھتے تھے؟ اور کشمیری ناقدینِ فن نے اقبال کی فکری تفہیم میں جو کردار ادا کیا وہ بھی کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ کشمیر کے بہت سارے سرکاری ادارے اور بہت ساری جامعات میں کئی طرح کی علمی و ادبی سرگرمیاں ایسی جاری ہیں جو کہ اس حوالے سے اعتبار کا درجہ رکھتی ہیں۔ وادی میں اقبال کے فکر و فن کو دیانت داری سے اور خلوص سے کیوں کر پرکھا جا رہا ہے۔ یوں مجموعی طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ اس مرتبہ کتاب میں زیادہ تر اقبال کے فکر و فن پہ ہونے والی مختلف سرگرمیوں اور مختلف اداروں کے ساتھ ساتھ مختلف لوگوں اور مختلف ناقدین کے حصّے کو بھی بطور خصوصی دیکھا گیا ہے۔

پروفیسر بشیر احمد نحوی کے ترتیب دیئے ہوئے پیامِ مشرق'' کو 1989ء میں اقبال اکیڈمی، سری نگر کشمیر نے شایع کیا۔ بہتر صفحات پر مشتمل اس انتخاب کے دو حصّے ہیں۔ ایک حصّہ میں مضامین اور دوسرے حصّہ میں منظوم نذرانے شامل ہیں۔

''پیامِ مشرق'' کا پہلا مضمون ''اقبال: صرف مسلمانوں کے شاعر؟'' کے عنوان سے ہے۔ یہ مضمون جگن ناتھ آزاد کا ہے۔ جگن ناتھ آزاد کے بارے میں ادب سے دل چسپی رکھنے والا قاری جانتا ہے کہ ان کا شمار ماہرینِ اقبال میں ہوتا ہے اور وہ اُردو اور انگریزی میں اقبال پہ کئی کتابیں لکھ چکے ہیں، بل کہ آزاد تو اقبال کے ان عاشقوں میں شمار ہوتے ہیں جن کو ان ہی کے مذہب کے لوگوں نے طعنے بھی دیے اور معتوب بھی قرار دیا۔ اس کے باوجود وہ فکرِ اقبال کے سرچشموں کا سراغ لگانے پہ ڈٹے رہے اور برملا اس کا اظہار کیا کہ اقبال کی آفاقی فکر کے پیچھے قرآنی فِکر ہے۔

''اقبال: صرف مسلمانوں کے شاعر؟'' مضمون میں بھی آزاد نے فکرِ اقبال کا دفاع اس انداز سے کیا ہے کہ بہت سے ناقدین کے اعتراض کا جواب بھی مل جاتا ہے۔ اکثر ناقدین نے اقبال کی شاعرانہ فِکر کو محدود کر دیا اور یہ کہا کہ اقبال کی فکر بہت محدود ہے، وہ انسان کے بجائے صرف مسلمان کی بات کرتا ہے۔ اس کے کلام میں آفاقیت اس طرح سے نہیں ہے جس طرح غالب یا میر کے ہاں ہے۔

''اقبال: صرف مسلمانوں کے شاعر؟'' اِس مضمون میں پہلے وہ ان ناقدین کے اعتراضات کی نفی کرتے ہیں، جن کے خیال میں اقبال محدود فکر کا شاعر ہے؛ پھر ان ناقدین کے اعتراضات کی بھی نفی کرتے ہیں، جن کے بقول اقبال مغربی مفکرین سے اس قدر مرعوب ہیں کہ انھی کی فکر کے تتبع میں اپنی فکر بھی ڈھالنا چاہتے ہیں بل کہ بشیر احمد نحوی نے اس قدر تصحیح کی اور یہ تک بتایا کہ اقبال نے مغرب کی اچھی اقدار کو ہی جذب کیا، ہر قسم کی فکر سے مرعوب نہیں ہوئے۔ اس کے بعد وہ اس اعتراض کا مدلل جواب دیتے ہیں کہ جس میں یہ کہا گیا ہے کہ اقبال صرف مسلمانوں کے شاعر ہیں، جگن ناتھ آزاد نے اس اعتراض کا جواب دیا ہے۔ اسی مضمون میں ایک اور جگہ پہ جگن ناتھ آزاد نے اقبال کو پوری انسانیت کی بیداری کا شاعر کہا ہے۔

''پیامِ مشرق'' کا دوسرا مضمون ''شعاعِ آفتاب۔۔۔اقبال کی ایک بہترین نظم'' کے عنوان سے ہے۔ اس مضمون کے لکھاری ڈاکٹر حامدی کاشمیری ہیں۔ اقبال کی یہ نظم ان کے مجموعۂ کلام ''بانگ درا'' میں شامل ہے۔ اِس نظم میں فکر و فن کی پختگی کمال بلندی پر ہے۔ حامدی کاشمیری نے اس نظم کے انفرادی پہلوؤں پہ روشنی ڈالی ہے اور کہا ہے کہ یہ نظم بہت سے شارحین اور ناقدین کی نظر میں نہیں جچی، حالاں کہ اس میں فکری و فنی عناصر کا امتزاج بہت ساری دوسری نظموں کے مقابل ہے۔ اس نظم میں تخیل کی کارفرمائی ہے۔ اس نظم میں دو مرکزی شعری کردار ہیں جب کہ ایک ضمنی کردار ہے۔ مرکزی کرداروں میں وہ لوگ ہیں جو سوئے ہوئے ہیں۔ مرکزی کردار ''سودائی نظارہ'' ہے۔ یہ فطرت سے محبت کرنے والا بھی ہے اور فطرت کو باطنی آنکھ سے دیکھنے کی صلاحیت رکھنے والا بھی ہے۔ دوسرا کِردار کرن کا ہے جو کہ عام کِرن نہیں ہے بل کہ جس میں بہت زیادہ تحرک، روشنی، حرارت، سوزِ زندگی کی چمک دمک ہے۔ اس کا اور سودائی فِطرت کا مکالمہ ہوتا ہے تو وہ کہتی ہے کہ میں غافلوں کو جگانے آئی ہوں۔ یہ بات سچ بھی معلوم ہوتی ہے کہ عام طور پہ ان کی وہی منظومات زیادہ زیرِ بحث آئی ہیں، جن میں اقبال کے طے شدہ شاعرانہ تصورات طے شدہ علامات کے ذریعے بیان کیے گئے ہیں یا جن میں مانوس علامتوں اور استعاروں کے ذریعے اقبال کی فکر کا ابلاغ ہوا ہے۔ ''شعاعِ آفتاب'' نظم میں علامتیں مانوس طریقے سے استعمال نہیں ہوئیں۔ یہ تمام تر نظم علامتی ساخت میں بھی سامنے آتی ہے۔

''حکیمِ مشرق'' کا تیسرا مضمون ''اقبال کی بہترین۔اُردو غزل'' کے عنوان سے ہے۔ یہ مضمون پروفیسر شوریدہ کاشمیری نے لکھا ہے۔ اِس مضمون میں اُنھوں نے بظاہر تو صرف ایک ہی غزل کی بات کی ہے جو کہ ''بالِ جبریل'' میں شامل ہے اور جس کا مصرع اولیٰ ہے ''میری نوائے شوق سے شور حریمِ ذات میں''۔ اِس غزل پہ تنقیدی نقطۂ نظر سے اس غزل کو اعلیٰ شعری، فِکری اور فنی خوبیوں کو بیان ہے۔ تنقید نگار نے اس غزل کے ہر ہر شعر کی نہ صرف الگ الگ تفہیم کی ہے بلکہ ان شعروں کو اقبال کے کلی نظامِ فکر میں رکھ کر بھی دیکھا ہے۔

''حکیمِ مشرق'' کا چوتھا مضمون ''شاعرِ اقبال'' کے عنوان سے ہے۔ اس مضمون کے لکھاری مظہر امام ہیں۔ اس مضمون ''شاعرِ اقبال'' میں مظہر امام نے اقبال کی شاعری میں فکر و فلسفے کی آمیزش کو تو مانا ہے؛ لیکن اس بات کو ماننے سے انکار کیا ہے کہ صرف فِکر کی گہرائی اور فلسفے کی آمیزش ہی کی وجہ سے ان کی شاعری آفاقی قدروں کو چھو رہی ہے بل کہ ان کے خیال میں شاعر کے فن کارانہ شعور کا بہت دخل ہے۔ کسی بھی شاعر کی اعلیٰ اور آفاقی شاعری کے لیے فکر و فن کا توازن اور امتزاج کام یابی کی دلیل ہے۔ اقبال کی فِکری جہات پر بہت زیادہ لکھا گیا ہے لیکن فنی محاسن کو درخور اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ اس مضمون میں مظہر امام نے مشہور و معروف فنی ذرائع کے حوالے سے بات کی ہے۔ ناقد نے اقبال کی بہت ساری منظومات کا بھی ذکر کیا ہے جن میں فکر کی بلندی کے ساتھ ساتھ فن کی پختگی کے عناصر بھی پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح انھوں نے اقبال کی غزلیات کے فنی محاسن پہ بھی بات کی ہے۔ عام طور پہ یہ دیکھا گیا ہے کہ غزل کے لیے تغزل کی صفت کا ہونا از حد ضروری ہے جس کے لیے عشقیہ مضامین میں سوز و گداز دل آویز اُسلوب کے ساتھ ساتھ لفظوں کی نرم روی بنیادی تقاضا ہے؛ لیکن اقبال نے اپنی غزلیات میں ایک نیا تغزل کا فَن دریافت کیا ہے جو روایتی تغزل سے ہٹ کر ہے۔ یوں اس کتاب

''حکیمِ مشرق'' کے اختتام پہ ہم دیکھتے ہیں کہ مضامین کی خاص ترتیب رکھی گئی ہے۔ پہلے اقبال کی شاعرانہ فکر پہ مفصل بات ہوئی ہے پھر نظمیہ شاعری کو ملحوظ رکھا گیا پھر غزلیہ نظام فکر سامنے رکھی گئی اور آخر میں خالصتاً اقبال کے شاعرانہ فنی وسائل پہ بات ہوئی۔ یہ فنی وسائل منظومات اور غزلیات میں نظر آتے ہیں۔ اقبالیات کے حوالے سے بشیر احمد نحوی کی ایک اور مرتبہ کتاب ''چشمۂ آفتاب'' کے عنوان سے ہے، جس کو بشیر احمد نحوی اور غلام رسول ملک نے ترتیب دیا ہے۔ اس کتاب کو اقبال اکیڈمی، سری نگر کشمیر نے ۱۹۹۴ء میں شایع کیا۔ اس کتاب میں درج ذیل مضمون شامل ہیں:

1. فلسفی اقبال۔۔۔ایک فلسفی استاد کی نظر میں	پروفیسر وحید الدینؒ
2. اقبال کا غیر متداوّل کلام۔۔۔ایک تنقیدی جائزہ	پروفیسر حامدی کاشمیری
3. اقبال اور اُردو زبان	حکیم منظور
4. اقبال کی عظمت کا راز	پروفیسر غلام رسول ملک
5. اقبال۔۔۔توحید اور رسالت	میر غلام رسول نازکی
6. دردشتِ جنونِ من	مرزا عارف بیگ
7. اقبال اور غنی۔۔۔ایک تقابلی مطالعہ	پروفیسر ایم اے شیدا
8. عہدِ حاضر میں کلام اقبال کی معنویت	پروفیسر مرغوب بانہالی
9. اقبال کا کارنامہ	ڈاکٹر بشیر احمد نحوی
10. اقبال۔۔۔خطابت کی جمالیات	ڈاکٹر قدوس جاوید
11. تیسری دنیا اور کشمیری شاعری	سید رسول پونپر
12. اقبال شاہ ہمدان کے حضور میں	محمد امین بچھ
13. اقبال کا انقلابی پیغام	محمد شفیع خان
14. تلمیحاتِ اقبال اور قرآن و حدیث	عبدالرحمان راتھر
15. دانائے راز۔۔۔میری نظر میں	انجینئر جی آر میر

''چشمۂ آفتاب'' کا پہلا مضمون ''فلسفی اقبال۔۔۔ایک فلسفی استاد کی نظر میں'' کے عنوان سے ہے جس کو پروفیسر وحید الدین کے ایک خطبہ سے اخذ کیا گیا ہے۔ اقبال اُردو کے واحد شاعر ہیں جن کی شاعری میں یہ بحث ہے کہ کیا اقبال کی شاعری میں فلسفے کی آمیزش ہے؟ اور اگر ہے تو کس حد تک ہے؟ فلسفہ چیزوں کی جڑوں تک جانے کا علم ہے بظاہر فلسفہ شاعری جیسی جذبات کی عکاسی کرنے والی چیز میں ثقالت کا باعث بنتا ہے؛ لیکن اگر کوئی بڑا فن کار ہے تو وہ ان دونوں عناصر کی آمیزش سے شاعری میں نئی جہت دریافت کر لیتا ہے۔ اقبال کی شاعری میں فلسفہ کی آمیزش تو موجود ہے۔ اس لیے کائنات سے متعلق بڑے بڑے سوالات ان کی شاعری میں در آئے ہیں؛ لیکن انھوں نے اپنے فلسفے اور شاعرانہ جذبات کو بے لگام نہیں چھوڑا۔ مزید یہ کہ اقبال کے بارے جو ایک رائے قایم کی جاتی ہے کہ اقبال نے مغربی مفکرین سے خوشہ چینی

کی ہے، اس نظریے کی تردید بھی اس مضمون میں نظر آتی ہے مزید براں یہ کہ اقبال نے صرف مسلم فلسفے کو شعر کی شکل دی ہے، اس نظریے کی تردید بھی نظر آتی ہے۔

کتاب ''چشمۂ آفتاب'' کا دوسرا مضمون ''اقبال کا غیر متداوّل کلام۔۔۔ ایک تنقیدی جائزہ'' کے عنوان سے ہے۔ اس مضمون کے مصنف پروفیسر حامدی کاشمیری ہیں۔ پروفیسر حامدی کاشمیری ماہرِ اقبالیات ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ثقہ نقاد بھی ہیں جن کو باقی شعرا کے متداول کلام کی خوبیوں خامیوں کا بھی اندازہ ہے۔ اس مضمون میں ایک طرف اقبال کے متداول کلام کی ترتیب کا ذکر کیا گیا ہے اور اس کی خوبیوں کو بھی جانچا گیا ہے جب کہ دوسری طرف اقبال کے کلام کو شامل نہ کرنے کی وجوہات بھی بیان کی گئی ہیں۔ جیسا کہ پہلے بھی مذکور ہوا ہے کہ اس مضمون میں حامدی کاشمیری نے کلام شامل نہ کرنے کی وجوہات کا جائزہ لیا ہے اور مناسب دلائل سے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ کیوں علامہ اقبال نے اپنا کلام ترک کر دیا تھا اور اس کو ''بانگ درا'' میں شامل نہیں کیا اس حوالے سے حامدی کاشمیری لکھتے ہیں:

> ''انتخاب کے وقت ان کی نظر کے سامنے وہ ساری تخلیقات نہ تھیں، جو مختلف جرائد اور اخبارات میں مختلف اوقات میں چھپ چکی تھیں یا بعض احباب کے پاس رہ گئی تھیں۔ اقبال کے محققین نے لکھا ہے کہ شروع میں وہ اپنی کوئی بیاض نہیں رکھتے تھے، جو چیز لکھتے تھے وہ کسی رسالے میں چھپواتے تھے یا کسی دوست کو بابت اشاعت دیتے تھے، لہٰذا اُنھوں نے مجموعے کی اشاعت کے موقع پر دستیاب کلام ہی پر تکیہ کیا۔''(13)

پروفیسر حامدی کاشمیری نے اقبال کے متداوّل کلام کے جوہر کو بھی خوب خوب پرکھا ہے اور بعض منظومات اور غزلیات کے اشعار کی تفہیم و تعبیر بھی کی ہے جو کہ واقعی یہ شاعری اقبال کی اچھی شاعری کی صف میں شامل ہو جاتی ہے۔ پروفیسر حامدی کاشمیری چوں کہ ایک محقق اور نقاد کا ذہن لے کر پیدا ہوئے، اس لیے اس مضمون میں ان کا محققانہ اور ناقدانہ ذہن چستی دکھاتا نظر آتا ہے۔ متداوّل کلام میں شامل منظومات اور غزلیات کی تعداد کے بارے میں بتایا ہے۔

''چشمۂ آفتاب'' کے تیسرے مضمون کا عنوان ''اقبال اور اُردو زبان'' ہے اور اس مضمون کے لکھاری حکیم منظور ہیں۔ اس مضمون میں حکیم منظور نے اقبال کی زبان دانی کے حوالے سے اعتراض کرنے والے ناقدین کو مدلل جواب دیے ہیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اقبال پنجابی ہونے کے باعث اُردو کے بھی محسن ہیں اور انہوں نے لسانیاتی سطح پہ اور لفاظی کے حوالے سے جو کچھ اُردو زبان کو دان کیا ہے وہ کسی اور کے حصّے میں کم ہی آیا ہے۔ اُنھوں نے بہت ساری شعری مثالیں دے کر یہ بات واضح کی ہے کہ اقبال نے اُردو لفاظی کی جہت کو نہ صرف متاثر کیا ہے بل کہ اُردو لفاظی کو بہت کچھ دان بھی کیا ہے۔ ادب و شعر سے دل چسپی رکھنے والے ہر طالب اور سنجیدہ نقاد کو اس کا عِلم ہے کہ بڑی شاعری، بڑی فکر اور بڑے اُسلوب کی ہم آہنگی کے بغیر وجود میں نہیں آ سکتی۔ اقبال کی شاعرانہ عظمت کا راز بھی اس کلیے میں مضمر ہے کہ انھوں نے بڑی فِکر کے ابلاغ کے لیے نئی طرح کی تلفیظ سازی کی اور اسلوبیاتی سطح پہ نیا آہنگ متعارف کروایا۔

''چشمۂ آفتاب'' کے چوتھے مضمون کا عنوان ''اقبال کی عظمت کا راز'' ہے۔ یہ مضمون غلام رسول ملک نے لکھا ہے۔ اُردو ادب سے تعلق رکھنے والے تمام بڑے بڑے ناقدین اور اہل نظر علما اس بات پہ متفق ہیں کہ اقبال کی آفاقی فکر نے مسائل اِنسانی کے تمام زاویوں پہ روشنی ڈالی ہے، کوئی بھی گوشہ ایسا نہیں ہے جہاں اقبال کی فکر اور سوچ کے زاویے نہ پڑے ہوں۔ اقبال کی عظمت و بزرگی کے کئی زاویے غلام رسول ملک نے بیان کیے ہیں جن میں ان کا سیاسی و سماجی نظریہ، روحانی بلوغت، انسانیت کے مسائل کا حل اسلام میں بتانا وغیرہ شامل ہیں۔ یوں ہم دیکھتے ہیں کہ اقبال کے فکری اختصاص کو ملک غلام رسول نے بہت احسن طریقے سے پیش کیا ہے اور تمام تر حقائق کا تجزیہ کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پہ پہنچے ہیں کہ اقبال نے جدید انسانی مسائل کا حل مادیت پرستی سے منہ موڑ کر روحانی اقدار کے دائرے میں داخل کرنے میں ہے۔ اس کے لیے مذہب بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور مذہب بھی وہ جو انسانی اقدار کی کامل عکاسی کرے، ان اقدار کے تمام تقاضوں کو پورا کرتا ہو۔

''چشمۂ آفتاب'' کے پانچویں مضمون کا نام ''اقبال توحید اور رسالت'' ہے۔ اس مضمون کے لکھاری میر غلام رسول نازکی ہیں۔ میر غلام رسول نازکی کا شمار چند بڑے اور نام ور ماہرینِ اقبالیات میں ہوتا ہے۔ میر غلام رسول نازکی مذہبی آدمی ہیں اور مذہبی رواداری کے قائل ہیں۔ اس مضمون میں اُنھوں نے اپنے مزاج کے مطابق اقبال کے نظریۂ توحید و رسالت کو احسن طریقے سے بیان کیا ہے۔ اسلام نے توحید کا جتنا اعلیٰ تصور دیا ہے کسی اور مذہب نے نہیں دیا۔ میر غلام رسول. نازکی نے اس تصور توحید کو اقبال کے اشعار کی روشنی میں دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔ توحید کے ساتھ ساتھ رسالت کو بھی اتنی ہی اہمیت ہے کیونکہ توحید کے تصور میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہی رسول ﷺ کی اطاعت ہے اور رسول ﷺ کی اطاعت ہی در اصل اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے اس لیے توحید اور رسالت کا توازن ہی مسلمانیت کی دلیل ہے۔

''چشمۂ آفتاب'' کا چھٹا مضمون ''دَردَشتِ جنونِ من'' ہے۔ اس مضمون کے لکھاری مرزا عارف بیگ ہیں۔ اس مضمون میں مرزا عارف بیگ نے اقبال کی تدبیر و فکر میں ارتقا کی منازل بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اقبال کی شخصیت کے بہت سارے اُن گوشوں پہ بھی روشنی ڈالی ہے جو پہلے روشنی سے اوجھل تھے یا جن کی وجہ سے ان کے کردار کو بعض اوقات معتوب قرار دیا گیا تھا۔ اقبال کی شاعری پہ سیر حاصل گفت گو کے بعد اور ان کی نشان زد کردہ عناصر عہد کی پیچیدگیوں پہ گفت گو کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پہ پہنچتے ہیں کہ:

> ''اللہ تعالیٰ کی فیوض و برکات سے اقبال کو اس سے بلند تر مقام نصیب ہوا اور ہر کس و ناکس شعوری یا غیر شعوری طور پر اقبال کو دلیل و برہانِ قرآن پاک کے ترجمان کی حیثیت میں اللہ کی نشانی آیت اللہ سمجھتا ہے۔''(14)

''چشمۂ آفتاب'' کے ساتویں مضمون کا عنوان ''اقبال اور غنی۔۔۔ ایک تقابلی مطالعہ'' ہے۔ اس کے لکھاری پروفیسر ایم۔ اے۔ شیدا ہیں۔ ملا طاہر غنی کاشمیری اور اقبال کے افکار میں بھی بہت حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔ ملا طاہر غنی کاشمیری

گیارہویں صدی عیسوی کے شاعر گزرے ہیں۔ اقبال کے اور ان کے افکار میں بہت حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔ زمانی حوالے سے اگرچہ ملا طاہر غنی بہت پہلے کے ہیں اور اقبال بہت بعد کے ہیں لیکن دونوں شعرا کی فکر، شاعرانہ پیرایہ ہائے اظہار، طبیعت کی درویشی و استغنا بہت حد تک ملتے جلتے ہیں۔

اس مضمون ''اقبال اور غنی۔۔۔ ایک تقابلی مطالعہ'' میں مضمون نگار نے دونوں شعرا کی اپنی وادی سے محبت اور وادی کے عوام کے دکھوں، تکلیفوں پہ کڑھنے اور عملی طور پہ کچھ کرنے جیسے خوبیوں کو اجاگر کیا ہے۔ نیز ملا طاہر غنی اور اقبال کے تصور غیرت میں بھی اشتراک کے عناصر دریافت کیے ہیں۔ اس کے علاوہ اقبال ملا طاہر غنی کے جس نظریے سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں وہ ان کا اس زندگی سے اگلی زندگی کو بامعنی سمجھنے والا نظریہ ہے۔ ملا طاہر غنی کاشمیری وہ شاعر ہیں جن کی فکر سے بڑے بڑے جید شعرا نے اکتساب کیا، جن میں مرزا غالب اور اقبال سرِ فہرست ہیں۔ دونوں شعرا کے درمیان جو اشتراکات اس مضمون میں دریافت کیے گئے ہیں وہ یہ ہیں کہ تصورِ غیرت و حریت، وادی کشمیر سے محبت کا شعری اظہار، فقر و استغنا، دنیا کی بے ثباتی وغیرہ کا مکمل احساس انہی مماثلتوں پہ بات کرتے ہوئے مضمون نگار لکھتے ہیں:

> ''غرض غنی اور اقبال کے یہاں فکری تطابق اور توافق کی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں۔ ان کی وجہ سے غنی اقبال کے محبوب شاعروں میں شامل ہو گئے ہیں۔''(15)

''چشمۂ آفتاب'' کے مضمون نمبر آٹھ کا عنوان۔۔۔ عہدِ حاضر میں کلامِ اقبال کی معنویت۔۔ ہے اس مضمون کے لکھاری پروفیسر مرغوب بانہالی ہیں جو کہ وادی کے مشہور ماہرینِ اقبالیات میں شمار ہوتے ہیں۔ کوئی بھی فن پارہ اس وقت تک نہ تو تادیر اپنی معنوی شناخت برقرار رکھ سکتا ہے اور نہ آفاقیت کی حدوں کو چھو سکتا ہے جب تک کہ اس میں فکر کی سطح آفاقی نہ ہو گی اور فکر کی پیشکش کے ذرائع میں کاملیت نہ ہو گی۔ اقبال اس حوالے سے قد آور شاعر ہیں کہ انھوں نے جو افکار و نظریات اپنی شاعری میں پیش کیے ہیں وہ آفاقی قدروں کے حامل ہیں۔ اس مضمون میں پروفیسر بانہالی نے جس مرکزی نکتے کو بنیاد بنا کر اقبال کی فکر کو آفاقی پیش کیا ہے جو مادیت پہ روحانیت کو فوقیت دینے کا فلسفہ ہے۔

''چشمۂ آفتاب'' کے مضمون نمبر نو کا عنوان ''اقبال کا کارنامہ'' ہے۔ اس مضمون کو ڈاکٹر بشیر احمد نحوی نے لکھا ہے۔ اس مضمون میں بشیر احمد نحوی نے اقبال کی شاعری کی اضافی خوبیوں کو بیان کیا ہے۔

''چشمۂ آفتاب'' کے دسویں مضمون کا عنوان ''اقبال۔۔۔ خطابت کی جمالیات'' ہے۔ اس کے لکھاری ڈاکٹر قدوس جاوید ہیں۔ اس مضمون میں ڈاکٹر قدوس جاوید نے جدید شاعری کی حسیت اور تقاضوں پہ سیر حاصل بات کی ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اقبال ہمارے ان شعرا میں شمار ہوتے ہیں جن کو کلاسیکی شاعری کی روایت کا شعور ہونے کے ساتھ ساتھ عہدِ جدید کے تمام سیاسی و سماجی تقاضوں کا بھی شعور تھا۔ اسی مضمون میں ان کے فلسفی و شاعر ہونے پہ بھی بحث و تمحیص ہوئی ہے اور مختلف ناقدینِ ادب کے حوالے سے اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ آیا اقبال مفکر

پہلے تھے یا فلسفی پہلے تھے یا شاعر پہلے تھے؟ خطیبانہ لہجہ عام طور پر شاعری کی کم زوری سمجھا جاتا ہے لیکن اقبال کے شاعری میں خطیبانہ لہجے کی گھن گرج نے انقلاب کا کام دیا ہے۔

''چشمۂ آفتاب'' کے گیارہویں مضمون کا عنوان ''تیسری دنیا کے لئے اقبال کی معنویت'' ہے۔ اس کے لکھاری مظہر امام ہیں جو کہ اُردو ادب کے مشہور نقاد ہیں۔ اس مضمون کے آغاز میں ہی انھوں نے چند ایک سوالات اٹھائے ہیں کہ ہم اُردو کے دو بڑے شاعروں میرؔ اور غالبؔ کے بارے بھی کہ سکتے ہیں کہ ان کے کلام میں تیسری دنیا کے لیے کوئی معنویت ہے؟ یا کیا وجہ ہے کہ اقبال نظم کے شاعر ہیں؟ اس لیے تیسری دنیا کے لیے ان کی شاعری معنویت کی حامل ہے؟ ان تمام سوالات کے جوابات وہ خود ہی دیتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ کن کن سماجی و سیاسی افکار کی وجہ سے وہ تیسری دنیا کے ممالک کے لیے آج بھی فکری معنویت کے حامل شاعر ہیں۔ سب سے پہلے وہ ان کے تصورِ جمہوریت پہ بات کرتے ہیں۔ اسلامی طرزِ حکم رانی کو استحسان کی نظر سے دیکھتے ہیں جس کا پرچار اقبال نے اپنی شاعری میں کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اقبال کی ان نظموں اور اس شاعری کا خصوصی ذکر کرتے ہیں جس میں استحصالی قوتوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی تجویز ملتی ہے۔ علاوہ ازیں اقبال کی وہ شاعری بھی مظہر امام کے خصوصی پیش نظر رہی ہے جس میں تیسری دنیا کے عوام کی امنگوں کی ترجمانی کی گئی ہو۔ مذکورہ بالا تمام افکار و نظریات پہ بات کرنے کے بعد وہ قارئین سے کچھ سوالات کرتے ہیں جن کے جوابات بھی انہی کے اندر سمٹے ہوئے ہیں وہ کہتے ہیں:

> ''کیا اقبال کی شاعری ثابت قدمی، استقامت، خود اعتمادی اور بے خوفی کا استعارہ نہیں! آج تیسری دنیا کو ایک شاعر سے اور کیا چاہیے!''(16)

''چشمۂ آفتاب'' کے بارہویں مضمون کا عنوان ''اقبال اور کشمیری شاعری'' کے عنوان سے ہے۔ اس مضمون کے لکھاری سید رسول پونپر ہیں۔ ان شعرا نے جذبۂ حب الوطنی، انقلاب، استحصال دشمنی کے ساتھ ساتھ بہت سارے دیگر موضوعات بھی اقبال سے لیے ہیں۔ شاعرانہ موضوعات کے ساتھ ساتھ شاعرانہ وسیلے، تلفیظ کاری، ڈکشن، تراکیب سازی کا عمل بھی بہت سارے شعرا نے اقبال سے ہی سیکھا۔ کسی بھی بڑے تخلیق کار کے تخلیقی تجربے کا اثر اس کے معاصرین اور اس کے بعد آنے والوں پہ ضرور پڑتا ہے بشرطیہ کہ اس کے تخلیقی تجربے میں یہ صلاحیت وصلابت ہو۔ اقبال کا تخلیقی تجربہ بہت پھیلاو کا حامل رہا ہے، یہی سبب ہے کہ اقبال کے بعد آنے والی نسل کے شعرا نے اقبال سے فکری و اُسلوبیاتی سطح پہ بہت اثر قبول کیا، جس کا تجزیہ بہت خوب صورتی سے لکھاری نے اس مضمون میں کیا ہے۔

''چشمۂ آفتاب'' کا تیرھواں مضمون ''اقبال شاہ ہمدان کے حضور میں'' کے عنوان سے ہے۔ اس کے لکھاری محمد امین بچھ ہیں۔ یہ اپنی نوعیت کا الگ ہی مضمون ہے جس میں اقبال اپنے روحانی مرشد مولانا روم کی طرح شاہ ہمدان سے کائنات کے اسرار و رموز جاننے کی خاطر کچھ سوالات کرتے ہیں جن کا شاہ تشفی بخش جواب دیتے ہیں۔ اسی طرح سوالات و جوابات اور مکالمہ نگاری کا یہ سلسلۂ حکمت کے جواہر ریزے بکھیرتا ہے۔ مثال کے طور پہ جب اقبال شاہ ہمدان سے یزداں کی بابت

سوال کرتے ہیں۔ اسی طرح اور بھی بہت سوالات کے جوابات شاہ ہمدان کی زبانی کہلوائے گئے ہیں۔ یہ مضمون اقبال کی خلاق طبیعت کا مکمل پتہ دیتا ہے۔

''چشمۂ آفتاب'' کے چودھویں مضمون کا عنوان ''اقبال کا انقلابی پیغام'' ہے۔ اس مضمون کے لکھاری محمد شفیع خان ہے۔ اس مضمون میں محمد شفیع خان نے اقبال کی انقلابی شاعری اور انقلابی افکار و نظریات پہ بات ضرور کی ہے؛ لیکن انقلاب کا مطلب گھن گرج والے اشعار نہیں، نہ طنطنے والا لہجہ مراد ہے بل کہ جس احسن طریقے سے انھوں نے بے عملی کی طرف راغب کرنے والے تصوف کی کثافت کو دور کیا؛ اس کا ذکر بہت خوب صورتی سے مضمون میں ہوا ہے۔

''چشمۂ آفتاب'' کا پندرہواں مضمون ''تلمیحات اقبال اور قرآن و حدیث'' کے عنوان سے ہے۔ اس مضمون کے لکھاری عبدالرحمان راتھر ہیں۔ اس مضمون میں انھوں نے تلمیح کے لغوی و اصطلاحی معنی متعین کرنے کے ساتھ ساتھ اقبال کے کلام سے قرآنی تلمیحات کو عمدہ طریقے سے بیان کیا ہے۔ علاوہ ازیں اس مضمون میں اور بھی بہت ساری تلمیحات کا ذکر ہے۔ جیسے ''ادعونی''، ''انی قریب''، ''امین امانت'' وغیرہ۔ تو مضمون نگار نے اقبال کی شاعری میں قرآنی تلمیحات کو بہت عمدگی سے بیان کیا ہے۔

''چشمۂ آفتاب'' کا سولھواں اور آخری مضمون ''دانائے راز۔۔۔میری نظر میں'' کے عنوان سے ہے، جس کے لکھاری انجینئر جی آر میر ہیں۔ اس مضمون میں لکھاری نے بہت انوکھے انداز سے اقبال کی شخصیت کو ان کے اشعار کی روشنی میں ہی دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔ علاوہ ازیں اقبال کے پیام خودی اور پیغام عشق رسول ﷺ پہ بھی کھل کے بات کی ہے۔

''اقبال بحر خیال میں'' ڈاکٹر بشیر احمد نحوی کی مرتبہ کتاب ہے جو فروری 2007ء میں مخدومی پرنٹرز سری نگر سے طبع ہوئی اور اقبال انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام شایع ہوئی۔ کتاب کی کل ضخامت 243 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں علامہ اقبال کے بارے میں پاک و ہند کے مقالہ نگاروں کے ایسے مضامین شامل ہیں جو اب ناپید و کم یاب ہیں۔ بازار میں تو بالکل دست یاب نہیں البتہ کچھ کُتب خانوں میں حوالے کے شعبے تک محدود ہیں۔ ان مضامین کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ ان میں تکرار کی علت پائی جاتی ہے لیکن ادب میں یہ کوئی ایسا عیب نہیں۔ بہت سے اشعار جو ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں، بہت سے اقوال زریں، کئی سنجیدہ مقولے یا کوئی بہت عمدہ نثر پارے جو بار بار پڑھنے، سننے یا کہے جانے پر بھی عجیب نہیں لگتے۔ لہٰذا ان مضامین کے بار بار پڑھنے، سننے سے انسانی ذہن کے کئی دریچے وا ہو سکتے ہیں، سوچ کے کئی نئے افق دریافت ہو سکتے ہیں حتیٰ کہ انقلاب بھی برپا ہو سکتے ہیں۔

مشہور و معروف اقبال شناسوں کے مضامین کو منتخب کر کے مجموعۂ مضامین کے طور پر یک جا کیا گیا ہے۔ آخری مضمون خود مرتب کا تحریر کردہ ہے۔ اس کتاب میں کُل تیرہ (13) مضامین کو شامل کیا گیا ہے۔ ابتدائیہ کے طور پر ''گفتنی'' میں وجہ مرتبہ مضامین بھی بتائی گئی ہے کہ کن وجوہ اور مقاصد کے تحت ان مضامین کو اکٹھا کیا گیا۔ مضامین کے عنوانات مع مصنفین درج ذیل ہیں:

1. اقبال کا فن۔۔۔ایک عمومی جائزہ	پروفیسر آلِ احمد سرور
2. شاعرِ مشرق اور شاعرِ انسانیت	پروفیسر عبدالمغنی
3. اسماالرجال، اقبال	ڈاکٹر محمد دین تاثیر
4. علامہ اقبال۔۔۔اجتہاد اور ختمِ نبوت	پروفیسر محمد منور
5. اقبال کی فیضانی یادوں کے سائے	ممنون حسن خاں
6. اقبال اور فیض	شفیق اشرفی
7. یونیورسٹیوں میں مطالعۂ اقبال کے دس سال	ڈاکٹر سید معین الرحمان
8. روایت، اقبال اور شریعت	ڈاکٹر علی محمد صدیقی
9. علامہ اقبال اور آغا حشر کاشمیری	ڈاکٹر محمد شفیع
10. شعری باقیات کی تدوین نو (جواز، مسائل اور طریقہ کار)	ڈاکٹر صابر کلوروی
11. اقبال شناسی میں بھوپال کا حصہ	صائمہ رفعت
12. فکرِ اقبال کی روشنی میں زرعی توسیع	چودھری مظفر حسین
13. اقبال شناسی یادریدہ دہنی۔ایک تجزیہ	پروفیسر بشیر احمد نحوی

ڈاکٹر بشیر احمد نحوی خود بھی اِقبال شناس ہیں۔اُنھوں نے اپنی خدمات اقبال کے حوالے سے وقف کر رکھی ہیں۔جہاں ان کی متعدد کتب اقبال شناسی پر تخلیق کردہ ہیں وہیں اُنھوں نے مشہور اقبال شناسوں کے مضامین کو یک جا کر کے مجموعوں کی شکل میں منظرِ عام پر لائے ہیں۔ان کے نزدیک کسی بھی مشہور مضمون کا بار بار چھپنا قابلِ اعتنا نہیں ہے بل کہ اقبال ایک ایسی شخصیت ہیں جن پر لکھی تحریر کو بار بار منظر عام پر لانا ان کی فکر کو وُسعت دینے کے مترادف ہے۔

''اقبال بحر خیال میں ''گفتنی'' کے بعد مضامین کا آغاز ہو جاتا ہے۔کتاب میں شامل پہلا مضمون بعنوان ''اقبال کا فن۔۔۔ ایک عمومی جائزہ''مشہور و معروف اقبال شناس پروفیسر آلِ احمد سرور کا تحریر کردہ ہے۔اِس مضمون میں اُنھوں نے اقبال کے فن پر خصوصی بحث کی ہے اور اپنی ناقدانہ بصیرت سے اقبال کے فن کے خصائص کو بیان کیا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ اقبال شناسوں کے اقبال پر اعتراضات کے حوالے سے بھی بیانات زیرِ بحث لائے ہیں جس سے یہ مضمون اقبال کی انفرادیت کو اُجاگر کرتا نظر آتا ہے۔

پروفیسر آلِ احمد سرور نے اقبال کے یہاں مختلف ادوار میں خطابت، غنائیت، فِکری صلاحیت کے حوالے سے بہترین معلومات فراہم کر دی ہیں۔اقبال نے کون سی تراکیب کو استعمال کیا، کون سی تشبیہات کو برتا اور کون سے استعارے استعمال کیے، ان کے حوالے سے خصوصی طور پر قلم فرسائی کی ہے اور آخر میں اقبال کی انفرادیت اور اہمیت کی مُسلمہ حقیقت پر روشنی ڈالی ہے۔علامہ اقبال فکر کے ساتھ ساتھ فن پر بھی گرفت رکھتے تھے۔اقبال رجائیت اور اُمید کو ضروری سمجھتے ہیں اور شاعری کی مذمت کرتے ہیں جو روح کو خوابیدہ اور بدن کو بیدار کرے یا موت کی نقش گری کرے۔ان کے

ہاں یقین کی دولت ہی سب کچھ ہے۔ اقبال کے فن کو دیکھا جائے تو ان کے ہاں تشکیک کا پہلو بھی ملتا ہے، تنہائی کا احساس بھی ہوتا ہے اور حزنیہ لے بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ اقبال زبان کے دروبست سے اچھی طرح واقف تھے اور زبان دانی کے اَسرار رموز سے شناسائی رکھتے تھے۔ ان کے نزدیک زبان ایک بُت نہیں جو جامد ہے بل کہ یہ ایک متحرک چیز ہے جس سے انسانیت کو باخبر اور متحرک رکھا جاسکتا ہے۔

مذکورہ بالا مضمون میں پروفیسر آلِ احمد سرور نے اقبال کی ایسی خصوصیات کی حامل کئی ایسی نظموں کا ذکر کیا ہے جو اُنھوں نے فن کے پیشِ نظر اور ردِ عمل کے تحت قلم زد کر دی تھیں۔ ایسی خصوصیات کا حامل کلام باقیاتِ اقبال کے نام سے شایع ہو چکا ہے جسے دیکھ کر اور پرکھ کر ایسی مذکورہ تمام خصوصیات کو دیکھا جاسکتا ہے۔ آلِ احمد سرور، اقبال کے فن میں لَے پر توجہ دلاتے ہوئے بتاتے ہیں کہ اقبال نو عمری میں داغ اور امیر کی زبان کے ساتھ ساتھ غالبؔ کی تازہ کاری اور سر سید کی تحریک کے زیرِ اثر رہے اور ان کے یہاں سے پیامی اور اصلاحی لے کو قبول کیا۔ ایسی ابتدائی کاوشوں میں نالہ یتیم اور یتیم کا خواب ایسی ہی نظمیں ہیں جو اِس امر کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ یوں آگے بڑھتے ہوئے اُنھیں ہمالہ میں الطاف حسین حالیؔ اور خطابیہ کے ساتھ غالبؔ کے فکر و فَن کا واضح اثر بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ اقبال غالب کے استعاراتی نظام سے بھی متاثر نظر آتے ہیں۔ مذکورہ بالا مباحث کے بعد پروفیسر آلِ احمد سرور معروف و مشہور اقبال شناسوں کی طرف رُغبت اختیار کرتے ہیں اور اِقبال کے فن پر کیے گئے اعتراضات کا جواب دیتے ہیں۔ وہ اقبال پر اعتراض کرنے والوں کو ہٹ دھرم تصور نہیں کرتے بل کہ وہ اُن کے اعتراض کو بھی ایک جامد نظام تصور کرتے ہیں۔ ان کے پاس بھی جواز تھا جس کے باعث اُنھوں نے اعتراضات کو پیش کیا جیسے کہ زبان دانی کے متعلق کیے گئے اعتراض کے متعلق وہ یوں گویا ہوتے ہیں:

> ''علامہ اقبال کی زبان پر اعتراض کرنے والوں کے پاس زبان کا ایک جامد تصور تھا۔ وہ زبان کی حفاظت کے علم بردار تھے۔ اقبال زبان کی ترقی کے، اس کے امکانات کے نقیب تھے۔ ان لوگوں کا زبان کا تصور ایک جوئے نرم خرام کا تھا، اقبال کا ایک جوئے کہستان کا۔''(17)

زبان دانی کے بعد ان کے خطابیہ انداز کو بہ طور اعتراض پیش کر کے اقبال کے فن کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کی گئی۔ ترقی پسندوں نے شاہین کی علامت کو سطحی تاویل کے طور پر پیش کیا اور اس کے ڈانڈے فسطائیت سے ملا دیے۔ لیکن اقبال ہفت اقلیم تھے۔ وقتی پروپیگنڈہ کے تحت تو ایسا ہونا ممکن تھا لیکن ہمیشہ کے لیے رد کر دینا آسان نہیں تھا۔ فراق کے نزدیک اقبال پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ اُنھوں نے اپنے فن میں اسلامی افکارات کو کیوں شامل کیا۔ کلیم الدین کو یہ اعتراض ہے کہ اقبال کی شاعری پیام کی لے میں ڈوبی ہوئی ہے جس کا عالمی منظر نامے میں کوئی اہمیت نہیں۔ مغربی معیارات پر ان کی شاعری پوری نہیں اترتی۔ نئی نسل نئے امکانات کی روشنیوں کو دیکھنا چاہتی ہے پرانی بجلیوں سے ان کا رشتہ مفقود نظر آتا ہے۔ گیان چند جین نے اقبال کے عروضی نظام کا اچھی طرح مطالعہ کیا اور آسان اور مشکل بحور کے حوالے سے اپنے اعتراض پیش کیے اور ساتھ ہی عربی لے اور عجمی لے کو بھی نشانہ بنایا۔ ان کے نزدیک اقبال آسان اور زیادہ مقبول اوزان

سے آہستہ آہستہ دور ہوتا جاتا ہے اور اپنے گہرے اَفکار کے لیے مشکل دشوار گزار اور رجزیہ قسم کے اوزان کا انتخاب کرتا ہے۔ پروفیسر آلِ احمد سرور نے گیان چند کے کیے گئے اعتراض پر روشنی ڈالی ہے۔ علامہ اقبال ہندوستانی فلسفے سے اچھی طرح واقف تھے۔ اُنھوں نے سنسکرت زبان سے شناسائی حاصل کر رکھی تھی۔ اُنھوں نے سنسکرت سوامی رام تیرتھ سے سیکھی تھی۔ اُنھیں برصغیر کے جنوبی مشرقی ایشیائی، جنوبی ایشائی، وسطی اور مغربی ایشائی تہذیب کے سرمائے سے گہرا شغف تھا۔ اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے پروفیسر آلِ احمد سرور لکھتے ہیں:

''اُردو پن میں بھی غالب کی شاعری، ابوالکلام کی نثر اور اقبال کی نظم کا شان دار رول تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں۔''(18)

اقبال تہذیب کے مرکب ہیں۔ ان کی روح عربی ہے، لباس ترک و تاتار و خوان سار اور اصفہان نے تیار کیا ہے۔ وہ جو اُردو لکھتے ہیں تہذیب کی نمایندگی کرتی ہے اور اس کو کسی صورت چھوڑا نہیں جا سکتا۔ ان کے الفاظ ذخیرہ عرب سے اور پھر سمرقند و بخارا سے ماخوذ ہیں۔

مذکورہ بالا مباحث کے بعد اِقبال کے فن میں خطابت، غنائیت اور فکری صلابت کی بات کی گئی۔ پروفیسر آلِ احمد سرور اقبال کے اُسلوب کو Grand Style کہتے ہیں۔ اس کے ساتھ مضمون کے وسط میں اقبال کے کلام میں موجود تراکیب، تشبیہات اور استعارات کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی ہے۔ اس حوالے سے بہت سی تراکیب، تشبیہات اور استعارات کو بہ طور امثال پیش کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اقبال نے مذکورہ بالا تراکیب و تشبیہات و استعارات کو استعمال کیا ہے۔ اقبال الفاظ کے معاملے میں کفایت شعار تھے اُنھوں نے الفاظ کا بے دریغ استعمال نہیں کیا بل کہ ایک اعلیٰ فن کار کی طرح جلال و جمال اور کفایت شعاری کو ملحوظ رکھا ہے۔

پروفیسر آلِ احمد سرور نے اقبال کے مذکورہ بالا اشعار میں تشبیہات کو عمدہ ترین تشبیہات قرار دیا ہے۔ اشعار دیکھیں:

صفِ بستہ تھے عرب کے جوانانِ تیغ بند
تھی منتظر حِنا کی عروس زمینِ شام
(بانگ درا۔ جنگ یرموک کا ایک
واقعہ۔ ص:247)

وہ نمودِ اخترِ سیماب پا ہنگامِ صُبح
یا نمایاں بامِ گردُوں سے جبینِ جبرئیلؑ(19)

پروفیسر مذکورہ بالا مضمون میں اقبال کے فن کے حوالے متعدد پہلوؤں کو زیرِ بحث لائے ہیں۔ اُنھوں نے اقبال کی انفرادیت اور اہمیت کی مُسلمہ حقیقت کو تسلیم کیا ہے۔ اُردو شاعری کے حوالے سے اُن کے افکار و نظریات آئندہ کے لیے پیش پیش رہے ہیں۔ اقبال ہر فن مولا تھے۔ مجموعی طور پر رائے دیتے ہوئے مضمون کے اختتامیہ میں رقم طراز ہیں:

''اُردو شاعری اب دوسرا اقبال پیدا نہ کر سکے گی مگر اقبال کا فن موجود اور
آنے والے فن کاروں کے لیے روشنی کا ایک مینار رہے گا۔''(20)

''اقبال بحرِ خیال میں''میں شامل دوسرا مضمون بہ عنوان ''شاعرِ مشرق اور شاعرِ انسانیت'' کے نام سے ہے جو پروفیسر عبدالمغنی کا تحریر کردہ ہے۔ اس مضمون میں برصغیر کے زیرِ عتاب زمانے کی عکاسی کی گئی ہے۔ جس ماحول میں اقبال نے جنم لیا اور اس سے قبل کا ماحول کس طرح کا تھا۔ اِقبال اس سے کس طرح متاثر ہوئے اور اقبال نے آئندہ کے لیے کیا لائحہ عمل اختیار کرنا چاہا، جیسے مباحث کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ نیز یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اُنھوں نے اپنی کن کن منظومات میں ایسے عوامل کی جھلکیاں پیش کی ہیں۔

اقبال جہاں شاعرِ مشرق ہیں وہیں وہ شاعرِ انسانیت بھی ہیں۔ اُنھوں نے تصورِ خُودی کے ذریعے انسان کی برتری کے لیے نظریات کو پیش کیا۔ پھر تصورِ ملت پیش کر کے ملتِ اسلامیہ کو ایک نہج پر لانے کی کوشش کی۔ خُودی کو خطی اور علاقائی لحاظ سے ماورا سمجھتے ہوئے مجموعی طور پر ملتِ اسلامیہ کو ترجیح دی۔ مذکورہ بالا عوامل کا بیان ان کے شعری سرمائے میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ اقبال نے جس عہد میں آنکھیں کھولیں اس وقت برصغیر کی کیا صورتِ حال تھی؟ انگریزوں کے زیرِ نگیں برصغیر کئی حوالوں سے متاثر ہوا، یہاں کے باسیوں پر ظلم و جبر کی انتہا کی گئی۔ عوام و خواص کی تفریق روز بروز بڑھ رہی تھی۔ اجارہ داری کے رجحانات نمایاں ہو رہے تھے۔ فتنہ فساد کا بازار گرم تھا۔ انہی مفادات کی کش مکش میں پہلے جنگِ عظیم اوّل اور پھر جنگِ عظیم دوم جیسے نتائج دیکھنے کو ملے لیکن سب سے زیادہ متاثر انسانیت رہی۔ ایشیا اور افریقہ دو ایسے خطے تھے جو انگریزوں کے زیرِ تسلط آ کر افراتفری اور بدامنی کا شکار ہوئے۔ معیشت اور معاشرت پستی اور تنزلی کی طرف چلی گئی۔ ایسے کئی عوامل پیش پیش رہے۔ ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو اس کے ساتھ ساتھ ایسے کئی عوامل بروئے کار لائے گے جو برصغیر کے خطے کی ترقی اور اسے بہتر کرنے کے لیے ضروری تصور کیے جا سکتے ہیں۔ مغرب کی صنعتی، سائنسی اور تکنیکی ترقیات کو انسانیت کا مشترک ورثہ سمجھ کر اختیار کیا گیا۔ تحقیق و تنقید کے جدید ترین وسائل تک وسعت بھی دیکھنے کو ملی۔ صرف مقاصد کی تبدیلی درکار تھی، جس کے لیے وسعتِ نظر، بلندیِ خیال، حقیقت پسندی اور بصیرت مندی کی ضرورت تھی۔ مذکورہ بالا تمام حالاتِ کے پیشِ نظر اقبال کے لیے ایک ایسا لائحہ عمل تیار کرنا تھا جس سے حالات سے نپٹا جائے اور قوم کی اصلاح و ترقی کی طرف توجہ مبذول کرائی جائے اور ان میں ایک نیا ولولہ پیدا کیا جا سکے تاکہ وہ بھی ترقی کی نہج کو پا سکیں۔ پروفیسر عبدالمغنی لکھتے ہیں:

''اس تناظر میں اقبال نے اصلاحِ احوال کے لیے خُودی کا نظریہ پیش کر کے
عصرِ حاضر میں انسانیت کی تشکیلِ جدید کا ایک نیا نقشہ مرتب کیا۔''(21)

اقبال کثیر الجہت شخصیت تھے۔ اُنھوں نے مشرق کے ساتھ ساتھ مغرب کی تہذیب و ثقافت کو اچھی طرح پرکھ رکھا تھا۔ اس لیے اُنھوں بہ طورِ شاعرِ انسانیت نظریۂ ملت پیش کر کے ملتِ اسلامیہ کو ایک نہج پر لانے کی کوشش کی۔ وہ متعلم، معلم، وکیل اور سیاست داں کی مختلف حیثیتوں سے ان کے مطالعات و مشاہدات اور تجربات و اقدامات نے انھیں آج کی زندگی کے تمام پہلوؤں کے براہِ راست ادراک کا موقع دیا۔ اپنی تربیتِ ذہنی کے لحاظ سے وہ یقیناً ایک فلسفی تھے؛ لیکن ان کے وارداتِ قلبی نے انھیں ایک قلندر یا درویش بنا دیا۔ اس طرح ان کی شخصیت میں عقل و عشق کا توازن پیدا ہوا۔ ساتھ ہی ان کے کردار کی حرکیت نے انھیں جدوجہد پر آمادہ کیا۔ لہٰذا وہ ایک حقیقت پسند عملی انسان بن گئے اور وسعتِ نظر کے ساتھ ٹھوس منصوبے بنانے کے قابل ہوئے۔

مجموعی طور پر اقبال بطورِ شاعرِ مشرق اور شاعرِ انسانیت کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ اُنھوں نے بانگِ درا، پیامِ مشرق اور ضربِ کلیم کی نظموں اور غزلوں میں خُودی اور ملت کے تصور کو پیش کر کے مسلمانوں میں اسلام کی خوابیدہ رُوح کو بیدار کرنا چاہتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ افتادگانِ خاک اور مزدور کے حق میں الفاظ آرائی کرتے ہیں اور مغرب کی چیرہ دستیوں کو بھی طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔

مجموعۂ مضامین ''اقبال بحرِ خیال میں'' میں شامل تیسرا مضمون ''اسماءالرِجالِ اقبالؔ'' کے نام سے ہے جو کہ مشہور و معروف اقبال شناس اور اقبال کے ہم عصر ڈاکٹر محمد دین تاثیر کا تحریر کردہ ہے۔ ''اسماءُ الرِجال'' سے شخصیتوں کے نام مراد لیے جاتے ہیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر اشرف کمال رقم طراز ہیں:

''اشاریے میں اشخاص کے نام کو اسماء الرجال کہا جاتا ہے۔''(22)

یوں ''اسماء الرجالِ اقبال'' سے اقبال سے جُڑی اور ذِکر کردہ شخصیتوں کے نام مُراد لیا جا سکتا ہے۔ مذکورہ مضمون میں ڈاکٹر محمد دین تاثیر نے اقبال سے جُڑی شخصیات اور احباب کا ذکر کیا ہے۔ اور اُن کے ساتھ ان کے مراسم کیسے تھے؟ ان کا طور طریقہ، چال چلن اور انداز کیسا رہا؟ اِس بارے میں مختصر الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے۔ اقبال کے احباب میں تین قسم کی شخصیتوں کے نام آئے ہیں: اوّل ان کے برابر کی شخصیات، دوم: نیاز مندان اور سوم ہم عصر۔

برابر کی شخصیتوں میں جن کے نام گنوائے گئے ہیں اِن میں مولوی میر حسن، ابتدائی دوستوں میں امیر الدین وکیل، نواب ذوالفقار علی خاں، سر عبدالقادر، خوشی محمد ناظر، منشی سراج الدین، ملک حبیب جالندھری، میاں فضل حسین، امر اؤ سنگھ، شیو نرائن شمیم، ملک برکت علی، غلام رسول بیرسٹر، مرزا جلال الدین بیرسٹر شامل ہیں۔ نیاز مندانِ اقبال میں: چودھری محمد حسین، ڈاکٹر عبداللہ چغتائی، مولانا غلام قادر گرامی، ڈاکٹر میعار اللہ، پروفیسر حمید احمد خاں اور پروفیسر عبدالحمید، پروفیسر خلیفہ عبدالحکیم، لال دین قیصر، راجہ حسن اختر، میاں محمد شفیع، سید نذیر نیازی، مصطفیٰ حیرت شامل ہیں۔ ہم عصروں میں مولانا گرامی، شاد عظیم آبادی، اصغر گونڈوی، صوفی تبسم وغیرہ شامل ہیں۔ مذکورہ بالا مضمون اسماء الرجالِ اقبال کے حوالے سے نہایت اہم اور جامع ترین ہے۔ ڈاکٹر محمد دین تاثیر نے شخصیات سے جڑے واقعات کو بھی بیان کیا ہے جس سے

اقبال اور متذکرہ شخصیت سے اچھی طرح شناسائی ہو جاتی ہے۔ نیازِ مندانِ اقبال میں سے مولانا ظفر علی خاں، عبدالمجید سالک اور علامہ محمد اقبال کے مراسم کو بیان کیا ہے۔

ہم عصر شعرا میں علامہ محمد اقبال اور اصغر گونڈوی کا واقعہ خوب صورت پیرائے میں بیان کیا گیا۔ باہمی سمجھ بوجھ میں انتہائی حساس معاملے کو بیان کیا گیا ہے۔ جب اصغر گونڈوی غلط فہمی کا شکار ہوئے تو اس کے ازالے کے لیے اقبال کیا لائحہ عمل اختیار کرتے ہیں۔ مضمون کے آخری حصّہ میں ڈاکٹر دین محمد تاثیر نے اقبال کے ہر ایک قاری کو ان کا اسماء الرجال قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک اگر آپ اقبال کے شائق ہیں اور ان سے ملنا چاہتے ہیں تو کلامِ اقبال دیکھو، جو اقبال کا کلام پڑھتا ہے، وہ اقبال کا ملنے والا ہے۔ پیامِ مشرق اور بالِ جبریل بالخصوص زندہ اقبال ہے۔

کتاب ''اقبال بحرِ خیال میں'' میں شامل چوتھا مضمون بہ عنوان ''علامہ اقبال۔۔۔ اجتہاد اور ختم نبوت ﷺ'' کے نام سے ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کہ مضمون میں علامہ اقبال کا نظریۂ اجتہاد اور ختم نبوت کے حوالے سے ان مسائل کو زیرِ بحث لایا گیا۔ اقبال کے نزدیک اسلام کا تصور حیات جامد نہیں بل کہ متحرک ہے۔ کیوں کہ تحرک میں ہمیشہ کے لیے زندگی کی اُمید رہتی ہے اور جامد سوائے خاتمہ کے کچھ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال اسلام کو متحرک تصور کرتے ہیں اور بس۔

علامہ اقبال کی ''بانگِ درا'' میں شامل نظم ''چاند اور تارے'' اسی خیال کی وضاحت کرتی ہے۔ نظم کے چند اشعار دیکھیں:

اس رہ میں مقام بے محل ہے
پوشیدہ قرار میں اجل ہے
چلنے والے نِکل گئے ہیں
جو ٹھہرے ذرا، کچل گئے ہیں
انجام ہے اس خرام کا حُسن
آغاز ہے عشق، انتہا حُسن[23]

مذکورہ نظم 1905ء کی تحریر کردہ ہے۔ اس نظم کا آخری شعر مفکرانہ استدلال پیش کرتا ہے۔ اس وقت اقبال کی عمر کم و بیش تیس برس کے قریب ہو گی جب اُنھوں نے یہ نظم تخلیق کی۔ ان کی حیات میں اجتہاد اور ختمِ نبوت ﷺ کا عقیدہ ابتدا ہی سے پختہ تھا۔ اُنھوں نے اس خیال کی عکاسی نظم کے ساتھ ساتھ نثر میں بھی کی ہے۔ ان کا وہ مضمون جو ''مخزن'' میں بہ عنوان ''قومی زندگی'' کے نام سے چھپا اس میں اس کی واضح عکاسی ملتی ہے۔

مذکورہ مضمون کی روشنی میں دیکھا جائے تو پروفیسر محمد منور نے اجتہاد اور ختم نبوت ﷺ کے حوالے سے اس پہلو پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ عُلما کو زمانے کے مطابق خود کو ڈھالنا ہو گا اور اجتہاد اور ختمِ نبوت کے لیے موجودہ عہد کے مطابق جدید ترین لائحہ عمل تیار کرنا ہو گا۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اسی میں اجتہاد اور ختمِ نبوت کی بقا لازم ہے۔ علما کے ساتھ ساتھ

وہ افراد کو بھی اس کی تلقین کرتے ہیں۔ پروفیسر محمد منور نے مذکورہ مضمون میں اس پہلو پر توجہ دلائی ہے کہ زمانہ جدید کی ضرورتوں اور تقاضوں کے ساتھ ساتھ اسلام میں اجتہاد کے پہلوؤں کو بھی جدید تر کرنے کی ضرورت ہے۔ اسلام ایک متحرک چیز کا نام ہے اس میں کسی قسم کا جامد پن ہر گز موجود نہیں ہے۔ اسلام کی اصلی روح، بنیادی ہدایت و تعلیم کو بحال اور قایم رکھنے کے لیے اُصول وضوابط عمل کو یعنی فقہ کو ہر زمانے کا ساتھ دینا ہو گا۔ وحی کا اتمام خدائے رحمٰن کی طرف سے آدم کے حق میں یہ اعلان ہے کہ آدم رفتہ رفتہ عقلی بلوغت کی منزل پر پہنچ گیا ہے۔ اب اسے مزید پابند نہیں رکھا جا سکتا کہ وہ نئے احوال میں نئی وحی اور نئے پیغمبر کا منتظر رہے۔ آئندہ آدم کو قرآن کے بیان کردہ بنیادی احکام و اصول کی روشنی میں اپنی عقل اور تحقیق و جستجو سے مدد لینا ہو گی اور نہاد و بنیادِ اسلام کو قایم رکھتے ہوئے نئے نئے اُصول وضع کرنے ہوں گے۔

''اقبال بحر خیال میں'' کا چھٹا مضمون ''اقبال کی فیضانی یادوں کے سائے'' ممنون حسن خان کا تحریر کردہ ہے۔ مذکورہ بالا مضمون میں اقبال کے ساتھ گزرے اُن واقعات کو موضوع بنایا گیا ہے جب وہ علاج کے لیے بھوپال تشریف لائے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ مختلف شخصیات کے ساتھ اُن کے تعلق، رویے اور مزاج کو بھی موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔ اقبال چند ایک کتابیں اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ دیوانِ بیدل، دیوانِ غالب اور مثنوی مولانا روم اپنے ساتھ رکھتے۔ کھانا بہت قلیل مقدار میں کھاتے تھے۔ صرف دوپہر کا کھانا تناول فرماتے، رات کو صرف دلیہ لینا پسند کرتے۔ بریانی اور سیخ کباب اُن کی مرغوب غذا تھی۔ اقبال عمر کے آخری حصّے میں بھی قرآن پاک کی تلاوت اور نماز کے پابند رہے۔

ممنون حسن خان نے اقبال کے خادم علی بخش سے جڑے چند واقعات کو بھی رقم کیا ہے۔ اقبال اُن کی مونچھوں کی تعریف کیا کرتے تھے اور مونچھوں کا ذِکر کر کے اکثر مذاق کیا کرتے تھے۔ سر راس مسعود اور علی بخش کی آپس میں کافی بنتی تھی۔ اس مضمون میں اقبال سے جڑی یادوں اور واقعات کو قلم بند کیا گیا ہے۔ معلوماتی لحاظ سے مضمون اعلیٰ پائے کا ہے۔ جس میں اقبال سے متعلق چند ایسے واقعات کا بیان ملتا جو قاری کے لیے ایک خاصے کی چیز ہے۔

''اقبال بحر خیال میں'' کا ساتواں مضمون ''اقبال اور فیض (چند مطابقتیں)'' کے عنوان سے ہے جو شفیق اشرفی کا تحریر کردہ ہے۔ مذکورہ بالا مضمون میں اقبال اور فیض کے کلام کو تقابل کے پیرائے میں دیکھا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ فیض، اقبال سے جس قدر متاثر ہوئے اُن پہلوؤں کو بھی زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ اس مضمون میں فکری حوالے سے جس قدر فیض متاثر ہوئے اور اُن کے خیالات کو عہدِ جدید میں نئے اضافوں کے ساتھ پیش کیا ہے، ایسی چند ایک نظموں کی نشان دہی بھی کی گئی ہے۔ اگرچہ فیض نے اقبال کی شاعری کو موچی دروازے کی شاعری کہا ہے لیکن پھر بھی وہ اقبال سے انس رکھتے تھے اور اُن کی یاد میں اپنی غزل ''آیا ہمارے دیس میں اک خوش نوا فقیر'' لکھی تھی۔ غزلوں کے علاوہ ایسی نظم کی مثال بھی پیش کی گئی ہے جو اقبال نے ''تنہائی'' کے نام سے تحریر کی۔ اِسی نظم کو فیض نے بیسویں صدی کے پیرائے میں بہ عنوان ''تنہائی'' ہی پیش کیا۔ اقبال کی فکر سے ملتے جلتے خیالات کو عہدِ جدید کی روشنی میں پیش کیا ہے۔

کتاب ''اقبال بحر خیال میں'' میں شامل آٹھواں مضمون ڈاکٹر سید معین الرحمان کا ہے جو بہ عنوان ''یونیورسٹیوں میں مطالعۂ اقبال کے دس سال (1978ء تا 1988ء تک)'' ہے۔ اس مضمون میں اقبال پر ہونے والی تحقیق کو موضوعِ بحث بنایا گیا

ہے جو متعین کردہ سالوں میں ہوئی۔ اِس مضمون میں لکھاری نے اقبال کی فکری اور انکے فن پر ہونے والے تحقیقی کاموں کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ اس مضمون کی نوعیت تنقیدی کے ساتھ بہت کچھ تحقیقی بھی ہے۔ اس مضمون کی اضافی خوبی یہ ہے کہ اس میں مصنف نے جامعاتی سطح پہ ہونے والے کام کے علاوہ اس کام کی بھی نوعیت پیش کی ہے جو کہ اِنفرادی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

کتاب ''اقبال بحر خیال میں'' کا نواں مضمون ''روایت اقبال اور شریعتی'' ہے۔ اس کے لکھاری ڈاکٹر محمد علی صدیقی ہیں۔ اس مضمون میں لکھاری نے اقبال کے افکار اور ایران کے معروف سکالر علی شریعتی کے افکار میں مماثلت کا ذکر کیا ہے اور مثالیں دے کر ثابت کیا ہے کہ کس طرح اقبال کے افکار کی پیروی میں علی شریعتی نے شد و مد سے کام لیا۔ اسی طرح اقبال نے مغرب کے بارے جو رویہ اپنایا تھا علی شریعتی اس کو بھی تخصیصی نظر سے دیکھتے ہیں اور دنیا کے نامکمل ہونے کے جو اشارے قرآن میں اور پھر خود اقبال کی شاعری میں موجود ہیں علی شریعتی اس کو بھی دیکھتے ہیں اور داد دیتے ہیں۔

''اقبال بحر خیال میں'' کا دسواں مضمون ''علامہ اقبال اور آغا حشر کاشمیری'' کے عنوان سے ہے۔ اس کے مصنف ڈاکٹر محمد شفیع ہیں۔ اس مضمون میں مضمون نگار نے ایک ہی خطہ سے تعلق رکھنے والے دو ادیبوں یعنی علامہ اقبال اور حشر کاشمیری کی زندگی کے مختلف گوشوں اور فن کے مختلف زاویوں کے درمیان اشتراک کے بہت سارے پہلو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مضمون نگار بتاتا ہے کہ دونوں کے اجداد کشمیر سے اٹھ کر متحدہ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں پھیل گئے۔ دونوں نے تقریباً ایک ہی عہد میں ادب کے کوچے میں قدم رکھا پھر اقبال ولایت چلے گئے جہاں سے انھوں نے مغربی علوم سے استفادہ کیا اور آغا حشر نے ڈرامہ نگاری میں نام بنانا شروع کر دیا۔ مضمون نگار نے دونوں ادیبوں کی فکری و فنی کاوش پہ سیر حاصل گفت گو کی ہے اور حشر کاشمیری کی نظموں کا مطالعہ کر کے اس نتیجے پہ پہنچے ہیں کہ اقبال کے اُسلوب اور ان کی فکر کا بہت کچھ اثر حشر کاشمیری کی شاعری پہ بھی پڑا ہے۔ جہاں اقبال نے اُردو کے دیگر شعرا کو فکری و فنی سطح پہ متاثر کیا، وہاں ہی آغا حشر کو بھی متاثر کیا۔ لکھاری نے اقبال کی شاعری کے حشر کی شاعری پہ پڑنے والے اثرات کی طرف اہلِ نظر ناقدین کی توجہ مبذول کروانے کی کوشش بھی کی ہے۔ اسی طرح اقبال کے آغا حشر پہ اور آغا حشر کاشمیری کے اقبال کی شاعری پہ جو اثرات ہیں، ان کا ذکر بطور خاص اس مضمون میں ہوا ہے۔

''اقبال بحر خیال میں'' کا گیارہواں اور بارہواں مضمون پہلے موضوعِ بحث بن چکا ہے۔ اس لیے اب تیرہواں مضمون موضوعِ بحث بنے گا، جس کا عنوان ''فکر اقبال کی روشنی میں زرعی توسیع'' ہے۔ اس کو چودھری مظفر حسین نے لکھا ہے۔ اس مضمون میں لکھاری نے فکر اقبال کو زرعی توسیع کے حوالے سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ فکر اقبال میں جہاں جہاں توسیع کا پہلو نکلا ہے اور جس جس طریقے سے ان کی فکر میں تنوع اور خاص طور سے تمدنی معاملات رہے ہیں۔ اس کو لکھاری نے بہت عمدہ طریقے سے بیان کیا ہے۔

''اقبال بحر خیال میں'' کا آخری مضمون ''اقبال دشمنی یا دریدہ دہنی'' کے عنوان سے ہے، جس کو اس کتاب کے مؤلف بشیر احمد نحوی نے لکھا ہے۔ اس مضمون میں اقبال کی فکر اور ذات پہ ہونے والی بے جا اور بجا دونوں قسم کے نقد کا جائزہ لے کر

اطمینان بخش جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ بشیر نحوی اس حقیقت کا بھی اعتراف کرتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے کہ اقبال کی زندگی پہ تنقید نہیں کی جاسکتی، وہ کوئی ولی اوتار نہیں؛ لیکن جس طرح کے الزام ناقدینِ فن نے ان کی زندگی کے کچھ گوشوں یعنی آرام طلبی سستی اور بے عملی وغیرہ جیسے الزام لگائے ہیں، وہ بھی قابل قبول نہیں ہیں اور بشیر نحوی نے اسی طرح کے الزامات کا تشفی بخش جواب دیا ہے۔

بشیر احمد نحوی نے اقبال کی شخصیت اور فکر کے کم زیرِ بحث گوشوں کو گہرائی اور محبت کے ساتھ سمجھا اور انہیں نئے انداز سے قارئین کے سامنے پیش کیا۔ ان کی علمی کاوشیں نہ صرف اقبال کے کلام کی بہتر تفہیم میں مددگار ہیں بل کہ اقبال کے فکری سفر میں دلچسپی رکھنے والے ہر قاری کے لیے رہنمائی کا ذریعہ بھی ہیں۔ یوں نحوی صاحب نے فکرِ اقبال کی خدمت اور اس کی تشنگی کو پورا کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

حوالہ جات

1. بشیر احمد نحوی، ڈاکٹر، پیش لفظ، مشمولہ: اقبال کی تجلیات، از بشیر احمد نحوی، سری نگر: اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونی ورسٹی، 2002ء، ص3۔
2. قریشی، سمیع اللہ، فلسفۂ وجودیت اور اقبال، مشمولہ: اقبال کی تجلیات، از بشیر احمد نحوی، ص47۔
3. سلیم اختر، ڈاکٹر، حالی اور اقبال کے مقاماتِ آہ وفغاں، مشمولہ: اقبال کی تجلیات، از بشیر احمد نحوی، سری نگر: اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونی ورسٹی، 2002ء، ص100۔
4. منور، محمد، پروفیسر، کلامِ اقبال میں عربی ادب کے اثرات، مشمولہ: نفحاتِ اقبال، از بشیر احمد نحوی، سری نگر: اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونی ورسٹی، 2001ء، ص58۔
5. مجنوں گورکھپوری، اقبال، مشمولہ: نفحاتِ اقبال، از بشیر احمد نحوی، سری نگر: اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونی ورسٹی، 2001ء، ص79۔
6. ولی الدین میر، ڈاکٹر، مسلمان کی زندگی اور اقبال، مشمولہ: نفحاتِ اقبال، از بشیر احمد نحوی، سری نگر: اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونی ورسٹی، 2001ء، ص130۔
7. یوسف عزیز، اقبال۔۔۔ ایک رجائی شاعر، مشمولہ: نفحاتِ اقبال، از بشیر احمد نحوی، سری نگر: اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونی ورسٹی، 2001ء، ص167۔
8. ایضاً، ص169۔
9. ظہور الدین، پروفیسر، مطالعۂ اقبال: چند نئے زاویے (ایک جائزہ)، مشمولہ: اقبالیات گزشتہ دس سال (تحقیقی و تنقیدی جائزہ)، سری نگر: اقبال انسٹی ٹیوٹ، فروری 2004ء، ص27۔
10. ایضاً، ص40۔

11. تسکینہ فاضل، ڈاکٹر، اقبال انسٹی ٹیوٹ کی چند مطبوعات کا جائزہ، مشمولہ: اقبالیات گزشتہ دس سال (تحقیقی و تنقیدی جائزہ)، سری نگر: اقبال انسٹی ٹیوٹ، فروری 2004ء، ص85۔
12. عنایت ملک شہاب، ڈاکٹر، اقبالیات کا تنقیدی جائزہ: ایک تاثر، مشمولہ: اقبالیات گزشتہ دس سال (تحقیقی و تنقیدی جائزہ)، سری نگر: اقبال انسٹی ٹیوٹ، فروری 2004ء، ص112۔
13. حامدی کشمیری، پروفیسر، اقبال کا غیر متداول کلام: ایک تنقیدی جائزہ، مشمولہ: چشمۂ آفتاب، سری نگر: اقبال اکیڈمی، س۔ن، ص16–17۔
14. مرزا عارف بیگ، دردشتِ جنونِ من، مشمولہ: چشمۂ آفتاب، سری نگر: اقبال اکیڈمی، س۔ن، ص62۔
15. ایم۔اے شیدا، پروفیسر، اقبال اور غنی: ایک تقابلی مطالعہ، مشمولہ: چشمۂ آفتاب، سری نگر: اقبال اکیڈمی، س۔ن، ص70۔
16. مظہر امام، تیسری دنیا کے لیے اقبال کی معنویت، مشمولہ: چشمۂ آفتاب، سری نگر: اقبال اکیڈمی، 1994ء، ص120۔
17. بشیر احمد نحوی، پروفیسر، اقبال: بحرِ خیال (منتخب مضامین)، سری نگر: اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونی ورسٹی، فروری 2007ء، ص10۔
18. ایضاً، ص12۔
19. ایضاً، ص22۔
20. ایضاً، ص26۔
21. ایضاً، ص32۔
22. اشرف کمال، ڈاکٹر، ادبی اصطلاحات، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، 2017ء، ص56۔
23. ایضاً، ص64۔

References :

1. Bashir Ahmad Nahvi, Dr., Pesh Lafz, mashmoola: Iqbal ki Tajalliyat, az Bashir Ahmad Nahvi, Srinagar: Iqbal Institute, Kashmir University, 2002, p. 3.
2. Qureshi, Samiullah, Falsafa-e-Wujoodiyat aur Iqbal, mashmoola: Iqbal ki Tajalliyat, az Bashir Ahmad Nahvi, p. 47.
3. Saleem Akhtar, Dr., Haali aur Iqbal ke Maqamat-e-Aah-o-Fughan, mashmoola: Iqbal ki Tajalliyat, az Bashir Ahmad Nahvi, Srinagar: Iqbal Institute, Kashmir University, 2002, p. 100.

4. Munawwar, Muhammad, Professor, Kalam-e-Iqbal mein Arabi Adab ke Asraat, mashmoola: Nafahat-e-Iqbal, az Bashir Ahmad Nahvi, Srinagar: Iqbal Institute, Kashmir University, 2001, p. 58.
5. Majnoon Gorakhpuri, Iqbal, mashmoola: Nafahat-e-Iqbal, az Bashir Ahmad Nahvi, Srinagar: Iqbal Institute, Kashmir University, 2001, p. 79.
6. Mir Waliuddin, Dr., Musalman ki Zindagi aur Iqbal, mashmoola: Nafahat-e-Iqbal, az Bashir Ahmad Nahvi, Srinagar: Iqbal Institute, Kashmir University, 2001, p. 130.
7. Yusuf Aziz, Iqbal… Aik Rujai Sha'ir, mashmoola: Nafahat-e-Iqbal, az Bashir Ahmad Nahvi, Srinagar: Iqbal Institute, Kashmir University, 2001, p. 167.
8. Ibid., p. 169.
9. Zahooruddin, Professor, Mutala'a-e-Iqbal: Chand Naye Zaviye, aik Jaiza, mashmoola: Iqbaliyat Guzashta Das Saal (Tahqiqi o Tanqeedi Jaiza), Srinagar: Iqbal Institute, February 2004, p. 27.
10. Ibid., p. 40.
11. Tuskina Fazil, Dr., Iqbal Institute ki Chand Matbu'at ka Jaiza, mashmoola: Iqbaliyat Guzashta Das Saal (Tahqiqi o Tanqeedi Jaiza), Srinagar: Iqbal Institute, February 2004, p. 85.
12. Shahab Inayat Malik, Dr., Iqbaliyat ka Tanqeedi Jaiza: Aik Tassur, mashmoola: Iqbaliyat Guzashta Das Saal (Tahqiqi o Tanqeedi Jaiza), Srinagar: Iqbal Institute, February 2004, p. 112.
13. Hamidi Kashmiri, Professor, Iqbal ka Ghair Mutadawil Kalam: Aik Tanqeedi Jaiza, mashmoola: Chashma-e-Aftab, Srinagar: Iqbal Academy, n.d., pp. 16–17.
14. Mirza Arif Baig, Dar Dasht-e-Junoon-e-Man, mashmoola: Chashma-e-Aftab, Srinagar: Iqbal Academy, n.d., p. 62.
15. M. A. Shaida, Professor, Iqbal aur Ghani: Aik Taqabli Mutala'a, mashmoola: Chashma-e-Aftab, Srinagar: Iqbal Academy, n.d., p. 70.
16. Mazhar Imam, Teesri Duniya ke Liye Iqbal ki Ma'nawiyat, mashmoola: Chashma-e-Aftab, Srinagar: Iqbal Academy, 1994, p. 120.
17. Bashir Ahmad Nahvi, Professor, Iqbal: Behr-e-Khayal (Muntakhib Mazameen), Srinagar: Iqbal Institute, Kashmir University, February 2007, p. 10.
18. Ibid., p. 12.
19. Ibid., p. 22.
20. Ibid., p. 26.
21. Ibid., p. 32.
22. Ashraf Kamal, Dr., Adabi Istilahat, Islamabad: National Book Foundation, 2017, p. 56.
23. Ibid., p. 64.